Scanned

شعلۂ احساس

پیام شاہجہان پوری

ناشرین: کتب خانہ انجمن حمایت اسلام برانڈرتھ روڈ۔ لاہور

نام کتاب	شعلۂ احساس
موضوع	قومی و عالمی نظمیں
مصنف	پیامؔ شاہجہان پوری
بار اوّل	ایک ہزار
ضخامت	۱۶۰ صفحات
قیمت	[illegible] پیسے
مطبع	علمی پرنٹنگ پریس۔ لاہور
طابع	شیخ نیاز احمد پرنٹر
تاریخ طباعت	۳۰ نومبر ۱۹۶۷ء
ناشر	کتب خانہ انجمن حمایت اسلام براندرتھ روڈ۔ لاہور

کتابت۔ ادارہ پروینِ کتابت، رائل پارک شیخ بلڈنگ۔ لاہور

قومی

انسانی

اور

عالمی

مسائل پر مشتمل

نظموں کا مجموعہ

پیشِ لفظ

از فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں صدرِ جمہوریۂ اسلامیہ پاکستان

○

کچھ عرصہ قبل جب مجھے چند دانشوروں سے تبادلۂ خیالات کا موقع ملا تھا تو مَیں نے شعر و شاعری کے ضمن میں کہا تھا کہ اکثر شعرأ مشاعروں میں طبع آزمائی کرتے رہتے ہیں اور میرا گمان ہے کہ ان محفلوں میں وہ عموماً ملکی مسائل اور قومی امنگوں کو موضوعِ سخن بنانے کی بجائے گل و بلبل اور لیلیٰ مجنوں کی وہی پرانی داستانیں دہراتے رہتے ہیں۔ اِس طرح کئی ایک ہونہار شاعر اپنی فطری صلاحیتوں کو صحیح معنوں میں اجاگر کرنے سے محروم رہ جاتے ہیں۔

گو شروع سے میرا طبعی رجحان شعر و شاعری کی دلچسپیوں کی بجائے عملی سرگرمیوں کی طرف زیادہ رہا ہے اور پیشۂ سپاہ گری نے بھی جو مجھے خاندانی ورثے میں ملا ہے مجھے سخنوری کے میدان سے قدرے دُور رکھا ہے۔ تاہم مَیں

شاعری کی لطافت، قدرت اور اس کے اثر سے بخوبی واقف ہوں۔

ہر ذی ہوش جانتا ہے کہ ایک شاعر کا کلام اپنے ملک اور معاشرے پر کس حد تک اثر انداز ہو سکتا ہے۔ اِس کی کئی ایک مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ مثلاً انگلستان میں جان ملٹن اور جرمنی میں گوئٹے ایسے قادر الکلام شاعر پیدا ہوئے جنہوں نے قوم کو اس کے انحطاط کا احساس دلایا اور اس میں ایک تازہ روح پھونکی۔ نظریۂ پاکستان کا سہرا بھی ایک شاعر کے سر ہے جسے اگر بیسویں صدی کا امامِ سخن کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ میرا اشارہ شاعرِ مشرق علامہ اقبالؔ کی طرف ہے۔

بہر حال یہ میرے عام تاثرات ہیں۔ پیامؔ شاہجہانپوری کا مجموعۂ نظم دیکھ کر مجھے دِلی خوشی ہوئی کہ انہوں نے قومی اور عالمی مسائل کو اپنا موضوعِ سخن بنایا اور اپنے خیالات اور جذبات کا اظہار بہت دِلکش الفاظ اور پیرائے میں کیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ اُن کا کلام تمام حلقوں میں مقبول ہوگا۔

محمد ایوب خان

قصرِ صدر۔ راولپنڈی

عنوانات

پیام شاہجہانپوری

دیباچہ

از محترم جناب ڈاکٹر سید عبد اللہ صاحب ایم اے ڈی لٹ
صدر اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی سابق پرنسپل اورنٹیل کالج لاہور

پیامؔ شاہجہان پوری جانے پہچانے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری اپنے معاصرین سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہے۔ وہ غزل اچھی لکھتے ہیں اور غزل کی روایت سے اچھی طرح باخبر ہیں۔

شاعر غزل گو ہو یا نظم گو۔ اپنے زمانے کے واقعات و حوادث سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ یہ تو محض کم فہمی ہے کہ غزل لکھنے والے کو ہوائی باتیں کرنے والا آدمی سمجھا جاتا ہے۔ میرؔ۔ غزل کا امام۔ اس کے سارے دیوان زمانے کے سیاسی احوال کے اشاروں سے لبریز ہیں۔ البتہ سیاسی

احوال کی ترجمانی کے طریقے مختلف ہوتے ہیں۔ کوئی رمزیہ پیرائے میں
بات کرتا ہے کوئی تصویروں میں واقعات کی جھلک دکھاتا ہے۔ کوئی اس
کے برعکس راست اظہار کرتا ہے اور آہنگ سے کمی پورا کر لیتا ہے۔
پیامؔ نے "شعلۂ احساس" میں قومی اور اجتماعی تجربوں کو نظموں میں
بیان کیا ہے۔ وہ خود کہتا ہے ؎

میں پرستار تھا زلف و رخسار کا
حسن موضوع تھا میرے افکار کا
رخ مگر جب سے بدلا ہے اغیار کا
تو ہے اس دن سے مرکز مرے پیار کا
اے نگارِ وطن۔ میرے پیارے وطن

اپنے ہر غم کو اب بھول جاؤں گا میں
تیرے غم کو غمِ جاں بناؤں گا میں
تیری تصویر دل میں سجاؤں گا میں
گیت تیری محبت کے گاؤں گا میں
اے نگارِ وطن۔ میرے پیارے وطن

شاعر کا احساس اب غزل (غمِ جاناں یا غمِ جاں) سے غمِ ملت کی
طرف منتقل ہو رہا ہے۔ اس کی نمود یوں تو پہلے بھی تھی مگر ۶ ستمبر ۶۵، کی صبح
دراصل اس احساس کی شدت کا روزِ اول ہے۔ اسی لئے میں پاکستانی
شاعری کا روزِ آغاز اسی دن کو قرار دیتا ہوں۔ پیامؔ نے اپنی نظم "شکستِ شب"
میں اس صبح کے ماحول کی تصویر کھینچی ہے۔

شہر چپ چاپ تھا گاؤں خاموش تھے
قافلے منزلوں سے ہم آغوش تھے
رات تاریک تھی سخت گھمبیر تھی
سخت تاریک مانندِ کشمیر تھی
عین اس وقت سفاک چوروں کے غول
بزدلوں ڈاکوؤں مردہ خوروں کے غول
دل میں ناپاک ارادوں کا طوفاں لئے
سرحدِ پاک کی سمت بڑھنے لگے
شیطنت نے شرافت پہ حملہ کیا
ملک و ملت کی غیرت پہ حملہ کیا

یہی وہ مقام ہے جہاں پاکستانی احساس میں عظیم انقلاب آیا اور ایسی شاعری

اور ایسا ادب ظہور میں آیا جس کے نقوش ادب کے جملہ سابقہ رجحانات سے
مختلف تھے۔ ادیب اپنے مشرب کے اعتبار سے عالمگیر دکھ درد، انسانی غم و
تکلیف کا مصوّر اور ترجمان ہے۔ وہ نفرتوں کو مٹا کر محبت کا راستہ دکھاتا
ہے۔ وہ تنگ اور محدود تعصبات کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر ادیب
ان سب باتوں کے باوجود انسان بھی ہے اور انسان کے لئے یہ ممکن نہیں کہ
حفظِ ذات کے احساس سے بلند ہو جائے۔ اس کی ذات پر جب بھی حملہ ہوگا
وہ اس کے متعلق احساساتی اور نفسیاتی ردِ عمل کا اظہار کرے گا۔ پاکستانی ادیب
کے لئے یہ صورت حال ۶ ستمبر کے حادثے نے پیدا کی۔ اس کے خلاف وہ اٹھا
اور بڑی شدت سے اٹھا۔ اس کا یہ ہیجان خالص انسانی اور کاملاً فطری تھا۔

پیامؔ نے ان سب حوادث کا دکھ محسوس کیا ہے چنانچہ اس مجموعے
میں ہر بڑے حادثے پر نظمیں موجود ہیں۔ اس وقت پاکستانی قوم جن بڑے بڑے
اجتماعی مسائل سے دوچار ہے ان سب پر پیامؔ نے اپنے احساس کا
اظہار کیا ہے۔ پاکستانی مسئلوں پر ان کی رجزیہ نظمیں جوش انگیز ہیں اور
پاکستانی مزاج کی صحیح ترجمانی کرتی ہیں۔ ملک سے باہر کے مسائل اور عالمِ
اسلامی کے حوادث پر بھی پیامؔ نے کہیں آنسو بہائے ہیں کہیں دعوتِ
مقابلہ دی ہے۔ نظم "اسرائیل" میں انہوں نے یہودی قوم کی ازلی ابدی

ذلت و مسکنت کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ اپنے نبیوں کو قتل کرنے والی
قوم ابدی لعنت کی سزا یافتہ ہے۔

نظم "نوائے تلخ" میں عربوں کی موجودہ شکست و ناکامی پر اظہار رائے
کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ انہوں نے دین و سیاست کو جدا کرکے اور نسلی قومیت
کو اپنا عقیدہ بنا کر اسلامی شیرازہ بندی کو کمزور کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ
مسلمانانِ عالم کی ہمدردیوں سے محروم ہو گئے۔

پیامؔ نے مرض کی تشخیص تو ٹھیک کی ہے مگر وہ یہ نہیں بتا سکے کہ خود
پاکستان کے دانشوروں کا رخ بھی اسی طرف کیوں ہے۔ پاکستان میں
اسلامی روح کو کمزور کرنے کی منظم کوششیں جاری ہیں اور افسوس یہ ہے کہ
اس میں وہ بھی شریک ہیں جن پر اس جذبے کے تحفظ کی ذمے داری عائد
ہوتی ہے۔ بہرحال پیامؔ نے عربوں کو جو درس دیا ہے وہ ان کی جملہ پریشانیوں
کا علاج ہے۔

بیرونِ پاکستان کے اسلامی مسائل پر ان کی ساری نظمیں متوازن فکر
کا پتہ دیتی ہیں۔ "شاہ حسین"۔ "میثاقِ استانبول"۔ "قبرص"۔ "اوتھان"۔ "ابوبکر
تفاوا بلیوا"۔ ان کی اچھی نظمیں ہیں۔ دنیا کے دوسرے معاملات میں روڈیشیا
اور ویت نام کی جنگ عالمی احساس کی نمائندگی کرتی ہے اور ان میں پیامؔ کا

جذباتی ردِّ عمل وہی ہے جو دنیا بھر کے حریت پسندوں کا ہے ۔

پیامؔ کے سیاسی احساس کی دو سطحیں ہیں ۔ ایک سطح وہ ہے جس کا تعلق مسائلِ حاضرہ سے ہے مگر اس سے ملی ہوئی دوسری سطح وہ ہے جو ان کے تاریخی قومی شعور کا نتیجہ ہے ۔ وہ پاکستانی قوم کو محض ایک ناگہانی اور اتفاقی صورتِ حال کی پیداوار نہیں سمجھتے بلکہ مسلمانانِ ہند کی تاریخ کے قدرتی بہاؤ کا منطقی نتیجہ سمجھتے ہیں اس لیے وہ ان تاریخی واقعات کی یاد دلاتے ہیں جو نتیجہ خیز ثابت ہوئے اور جو بالآخر تقسیمِ ہند پر منتج ہوئے ہمارے ملک کے بعض دانشور پاکستان کو اس کے اسلامی پس منظر سے جدا کرنا چاہتے ہیں اور تعجب یہ ہے کہ پاکستان کے اسلامی پس منظر کے بھی منکر، ہڑپا، گندھارا اور موہنجوڈارو کو پاکستان کی تہذیب کا جزو قرار دے رہے ہیں ۔ یوں ایک پراچین "جاہلی" روح کو جس کی ترکیب آریا اور قبل آریا عناصر سے ہوتی ہے زندہ کرکے پاکستان کو ایک دوسرے طریقے سے ہندو خمیر کا جزو بنا دینا چاہتے ہیں ۔ پیامؔ نے مسلمانانِ ہند کے عظیم ابطال پر نظمیں لکھ کر پاکستان کو اس کے صحیح اسلامی پس منظر میں دیکھا ہے ۔ "مشہدِ بالاکوٹ" ۔ "شاہ اسمٰعیل شہید" ۔ "سید احمد شہید" ۔ "عظمت کے چراغ" ۔ "بھارتی حکمرانوں سے" اس

ضمن میں قابلِ ذکر نظمیں ہیں ۔

پیامؔ کی ان نظموں میں بیان کا خلوص اور زبان کی سادگی نمایاں ہے صناعانہ تکلف بہت کم ہے ۔ خیالات کا اظہار راست ہے ۔ یہ سادگی اتنی زیادہ ہے کہ شاعر نے لفظوں میں تصویریں بنانے کا کام بھی زیادہ نہیں کیا ۔ البتہ آہنگ ہر جگہ ہے جو تلافی کرتا ہے ۔ وہ رجز جن کے مخاطب خواص سے زیادہ عوام ہوں ان میں قدرتی طور پر سلاست اور تخاطب کی سہولت شاعر کے مدنظر ہے اس کا اطلاق شاعرانہ صناعی پر کر رہا ہوں ۔ پیامؔ نے اس صناعت پر آواز اور نوا کو ترجیح دی ہے ۔ نظموں کا موضوع اور موقعہ و محل اسی کا متقاضی تھا ۔

پیامؔ کی یہ نظمیں حیاتِ قومی کے ذخیرے میں ایک قیمتی اضافہ ہے امید ہے کہ قبولِ عام پائے گا ۔

سید عبداللہ

المأمن ۔
اردو نگر ۔ ملتان روڈ لاہور
۲۵ اکتوبر ۱۹۶۷ء

معروضاتِ شاعر

فنونِ لطیفہ میں شاعری کو سب سے مشکل اور نازک فن قرار دیا گیا ہے اور شاعری میں صنفِ غزل کو۔ اس میں شبہ بھی نہیں کہ دو مصرعوں میں ایک ایسے وسیع مضمون کو سمیٹنا یقیناً بہت مشکل کام ہے جس کا موضوع عشق کا بحرِ ناپیدا کنار ہو اور جس کے لیے دفتر کے دفتر درکار ہوں۔ اس کے لئے بڑی قادر الکلامی، بہت ریاض، بڑی دِقّتِ نظر اور ایک مخصوص شعری مزاج کی ضرورت ہوتی ہے جو بڑے لطیف اجزا سے ترکیب پاتا ہے لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ نظم اور پھر واقعاتی نظم لکھنا بھی کچھ کم مشکل نہیں۔ غزل گو شاعر کے لئے تو پھر بھی کچھ نہ کچھ آسانیاں ہیں۔ بنے بنائے سانچے موجود ہیں، مخصوص استعارے اور علامات ہیں کچھ تراکیب ہیں جن سے غزل گو شاعر غزل کا جادو جگانے میں کامیاب ہو جاتا ہے

مگر نظم اور واقعاتی نظم میں شاعر کو بہت کچھ ایجاد و اختراع سے کام لینا پڑتا ہے اور واقعات و جذبات کو ایک دوسرے میں سمونے کے ساتھ ساتھ بیان کا ربط و تسلسل برقرار رکھنے کے لئے بڑی جگر کاوی کرنی پڑتی ہے، سب سے زیادہ مشکل اس وقت پیش آتی ہے جب شاعر اپنی نظم کو خشک نعرہ بازی کی حدوں میں جانے سے روکنے کی کوشش کرتا ہے اور اسے ادب و فن کی حدود میں پابند رکھنا چاہتا ہے۔ شاعر اور ناظم میں یہی نازک فرق ہے کہ ناظم صرف واقعات کو نظم کرتا چلا جاتا ہے لیکن شاعر واقعات کو نظم کرنے کے ساتھ ساتھ فن، زبان، بیان، محاکات، جذبات نگاری اور شعریت کے تمام لوازم برقرار رکھتا ہے۔ بلا شبہ یہ کار شیشہ گری سے بھی زیادہ مشکل کام ہے۔ میں یہ دعویٰ تو نہیں کرتا اور نہ یہ دعوی کرنا مجھے زیب دیتا ہے کہ میری نظمیں اس معیار پر پوری اترتی ہیں، اس کا فیصلہ کرنا نقادانِ فن کا کام ہے۔

اب میں چند امور شاعر کی ذمہ داری کے متعلق عرض کرنا چاہتا ہوں۔ شاعر اپنے عہد اور ماحول کا ترجمان ہوتا ہے۔ میرے نزدیک وہ شاعر حقیقی شاعر نہیں ہو سکتا جو اپنے عہد کے واقعات و تحریکات سے اغماض برتنے

اور صرف اپنی ذات میں گم رہے کیونکہ ذات معاشرے سے الگ کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ ذات اور معاشرے میں بہت گہرا تعلق ہوتا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک شخص کے گھر میں آگ لگ جائے اور وہ سکون سے بسترِ استراحت پر لیٹا رہے اس زمانے میں جب کہ فاصلے سمٹ گئے ہیں اور نئے نئے مسائل پیدا ہو گئے ہیں دنیا کو ایک گھر کی سی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ ان حالات میں ایک حقیقی شاعر اپنے عہد کے واقعات سے چشم پوشی نہیں کر سکتا اور سچی بات تو یہ ہے کہ باشعور لوگوں کے لئے تو اس وقت بھی ملک ایک گھر کی حیثیت رکھتا تھا جب فاصلے سمٹے نہ تھے۔ ایک سچا فنکار اُس وقت بھی اپنے عہد کے واقعات و حالات سے متاثر ہوتا اور انہیں موضوعِ سخن بناتا تھا۔ میرؔ۔ غالبؔ۔ حالیؔ۔ اکبرؔ اور اقبالؔ کی شاعری ماحول کی عکاسی کی بہترین مثالیں ہیں۔ حتیٰ کہ داغؔ جیسا رندِ شاہد باز بھی اپنے عہد کے واقعات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا چنانچہ اس کا "شہر آشوب" اس عہد کی افراتفری کی منہ بولتی تصویر ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ میں نے اپنے آپ کو سچا فنکار ثابت کرنے کے لئے یہ تمہید باندھی ہے۔ مدعا صرف یہ ہے کہ اس مجموعۂ کلام کا مطالعہ کرنے والے میرے ادبی نظریات سے واقف ہو جائیں اور اس پس منظر میں ان نظموں کا مطالعہ

کریں۔ اس غلط فہمی کا ازالہ کر دینا بھی ضروری ہے کہ میں شاعر کے لئے واردات
عشق کو شجرِ ممنوعہ قرار نہیں دیتا۔ عشق کا جذبہ اور حسن کی کشش دو ایسی لافانی
صداقتیں ہیں جن کا انکار ممکن ہی نہیں۔ جمالیاتی ذوق شاعر کا سرمایۂ حیات ہے
اور اگر اسے زندگی سے خارج کر دیا جائے تو باقی ہی کیا رہ جاتا ہے۔ میں
خود بنیادی طور پر غزل گو شاعر ہوں، حسن سے پیار کرتا اور اسے متاعِ
حیات سمجھتا ہوں لیکن یہ کیسے ممکن ہے کہ میرے شہر میں ہولناک سیلاب آجائے
جو ہر خشک و تر کو بہا لے لئے جا رہا ہو اور میں اپنی محبوبہ کے گلے میں باہیں ڈالے
پیار کی باتیں کر رہا ہوں۔ اگر میں ایسا کرتا ہوں تو پاگل قرار دیا جاؤں گا یا غدارِ
شہر۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ موجودہ عہد کے شاعر کو حسن و عشق سے کوئی
سروکار ہی نہیں رکھنا چاہیئے مگر ہر چیز کا موقع و محل ہوتا ہے اور ہر چیز اپنے
مقام پر ہی اچھی معلوم ہوتی ہے، زندگی مختلف شعبوں میں بٹی ہوئی ہے اور ہمیں
ہر شعبے کو اس کا حق دینا چاہیئے۔ جب شاعر کے سینے میں داخلی جذبات ہیجان پیدا
کر دیں یا وہ حسن سے متاثر ہو جائے تو اسے اپنے احساسات کو صفحۂ قرطاس پر ضرور
منتقل کرنا چاہیئے کیونکہ ایسا نہ کرنا شعر و ادب کے ساتھ ناانصافی ہے مگر زندگی
میں صرف حسن اور عشق ہی تو نہیں کچھ اور بھی تو ہے۔ اگر کسی وقت دشمن

ہمارے ملک پر حریصانہ نگاہ ڈالے تو ہمارے شاعر کے سینے میں اسی شدت
سے ہیجان اور جذبات کا تلاطم پیدا ہونا چاہیئے جس شدت سے ایک حسین
کی قاتلانہ ادا شاعر کے جذبات میں ہلچل پیدا کر دیتی ہے، اگر معاشرے میں
خرابیاں سر اٹھاتی نظر آئیں تو اسے اسی شدت سے بیچین ہو جانا چاہیئے۔
میری ناچیز رائے میں ایسا شاعر حقیقی شاعر اور سچا فنکار کہلانے کا مستحق ہے۔

اب رہ جاتا ہے اظہار و ابلاغ کا مسئلہ، فن کا مسئلہ، ان
پابندیوں کا مسئلہ جو اساتذۂ فن نے ہم پر عائد کی ہیں۔ اس سلسلے میں
لکھنے والوں کے دو گروہ ہیں۔ کچھ لوگ اظہار کے پرانے طریقوں کو
موجودہ عہد کے لئے غیر موزوں سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں فن کی پابندیاں
ادب کی ترقی میں سنگِ راہ ہیں۔ یہ حضرات ان پابندیوں کے خلاف علمِ
بغاوت بلند کرنا شعر و ادب کی ترقی کے لئے ضروری قرار دیتے ہیں، ان
میں سے بعض تو بحور و اوزان کے پرانے سانچوں ہی کو توڑ دینا چاہتے
ہیں۔ دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو اساتذۂ فن کے متعین کئے ہوئے
راستے سے سرِمو انحراف کرنا بھی جرم سمجھتے ہیں۔ وہ انہیں کے لگے بندھے
راستے پر چلتے ہیں اور دوسروں کو بھی انہیں کے راستے پر چلانا چاہتے ہیں۔ میرے

خیال میں ان دو راستوں کے علاوہ ایک تیسرا راستہ بھی ہے جسے اعتدال کا راستہ کہا جا سکتا ہے اور میں نے وہی راستہ اختیار کیا ہے۔ وہ یہ کہ ہمارے قدیم اساتذۂ فن نے بڑے غور و فکر اور وسیع علم و تجربے کے بعد عروض اور بیان کے کچھ اصول مقرر کئے تھے جن پر کاربند رہ کر انہوں نے ایک عالم سے اپنے کمالِ فن کا لوہا منوا لیا اور اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ ان کے وضع کردہ اصول ہر لحاظ سے قابلِ عمل ہیں اور ان پابندیوں میں رہ کر بھی ایسا شعر کہا جا سکتا ہے جو ایک طرف سننے والے کے دل میں اتر جاتا ہے اور دوسری طرف فن کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ یہ بزرگ انسان ہی تھے۔ ان کے مقرر کئے ہوئے اصول و قواعد بشری کمزوریوں سے مبرا قرار نہیں دیئے جا سکتے۔ ان عروضیوں اور اساتذۂ فن نے فنِ شعر کے قواعد وضع کرتے وقت بعض جگہ ضرورت سے زیادہ سختی سے کام لیا ہے۔ اگر ہم ان کی بعض ناروا پابندیوں سے آزادی حاصل کر لیں اور اس کے نتیجے میں شعر و ادب کی ترقی کے لئے دروازے کھل جائیں تو یہ امر مذموم نہیں بلکہ مستحسن ہوگا۔ مثال کے طور پر ہمارے قدیم اساتذہ نے

ہندی اور فارسی زبانوں کے الفاظ کے درمیان عطف و اضافت کو ناجائز قرار دیا ہے۔ میں ذاتی طور پر اس خیال کا حامی ہوں کہ یہ پابندی قبول کرتے وقت ہمیں اپنے وجدان کو رہنما بنانا چاہیئے۔ اگر ہندی اور فارسی الفاظ کا مرکب بھونڈی شکل اختیار کرتا اور کانوں کو ناگوار معلوم ہوتا ہے تو یقیناً ایسا مرکب قابلِ قبول نہیں ہو سکتا اور یہ شعر و ادب کو کند چھری سے ذبح کرنے والی بات ہے مثلاً اگر کوئی شخص اس پابندی سے آزاد ہونے کے شوق میں "انبارِ خس" کی بجائے "ڈھیرِ خس" لکھتا ہے تو ظاہر ہے کہ یہ ترکیب نہایت بھونڈی اور کانوں کو سخت ناگوار معلوم ہوتی ہے لیکن اگر ایک شاعر ضرورتِ شعری کے تحت "سایۂ شمشیر" کی بجائے "سایۂ تلوار" لکھتا ہے تو گو سایہ فارسی زبان کا لفظ ہے اور تلوار ہندی زبان کا۔ مگر ان دونوں کے درمیان اضافت کے استعمال سے جو مرکب بنا ہے اس میں نہ تو بھونڈا پن ہے اور نہ یہ کانوں کو ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ اس قسم کی تراکیب جائز قرار دینی چاہئیں۔ میں نے اسے جائز رکھا ہے اور اپنی ایک نظم میں "سایۂ تلوار" کی ترکیب نظم بھی کی ہے۔ اسی طرح اعلانِ نون کا مسئلہ ہے اس کی بھی

اساتذۂ فن نے پابندی کی ہے ۔ میرے نزدیک یہ پابندی بھی کچھ غیر ضروری ہے ۔ یہی معاملہ ایطا کا ہے ۔ ایطائے جلی تو یقیناً بہت بڑا نقص ہے جس سے شعر کا صوتی حسن تباہ ہو جاتا ہے لیکن ایطائے خفی کو فنی عیوب کی فہرست سے خارج کر دینا چاہیئے ۔ میرا نظریہ یہ ہے کہ معمولی سے فنی سقم کو دور کرنے میں اگر ایک اچھے شعر کا خون ہوتا ہے تو یہ شعر و ادب کی خدمت نہیں بلکہ اس کے ساتھ زیادتی ہے ۔

اب میں چند باتیں بحور و اوزان کے متعلق کہنا چاہتا ہوں ۔ میرے خیال میں فنِ عروض کا سب سے زیادہ نازک پہلو یہی ہے ۔ گو دورِ جدید کے بعض شعرا نے اس میں بھی تجربات کئے اور بعض ہندی بحروں کو اردو شاعری میں رواج دینے کی کوشش کی جیسے فراق گورکھپوری ۔ یہ موقع اس بحث کا نہیں کہ ان کی یہ کوشش کہاں تک کامیاب ہوئی اور ان حضرات کی ایجاد کردہ بحریں اردو شاعری میں رواج پا سکیں یا نہیں ؟ البتہ اس سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ عہدِ موجودہ تجرباتی دور ہے اور قدیم و جدید میں مسلسل رسّہ کشی جاری ہے ۔ یہ الگ بات کہ اساتذۂ فن نے جو بحور و اوزان متعین کئے تھے انہیں قبولِ عام کی

سند پہلے بھی حاصل تھی اور آج بھی حاصل ہے البتہ بعض بحریں ضرور ایسی ہیں جو بعض دوسری بحروں سے صوتی اعتبار سے ہم آہنگ ہیں اور میرے خیال میں اگر ایک ہی غزل یا نظم میں ایسی دو بحروں کو استعمال کر لیا جائے تو اس میں مضائقہ نہیں ہونا چاہیئے مثال کے طور پر ایک بحر ہے متدارک مخبون شانزدہ رکنی جس کا وزن ہے ۔ فعلن فعلن ۔ فعلن فعلن ۔ فعلن فعلن ۔ فعلن فعلن ——————— اور اسی بحر میں یہی وزن معمولی سے تغیر سے یوں ہے فعلن فعلن ۔ فعلن فعلن ۔ فعلن فعلن ۔ فعلن فع ۔ ان دونوں اوزان کے سارے رکن یکساں ہیں ، صرف آخری رکن کی ایک حرکت کا فرق ہے یہی وجہ ہے کہ بعض اساتذہ نے اسے جائز قرار دیا ہے کہ ایک ہی غزل یا نظم کے کچھ شعر ایک وزن میں ہوں اور کچھ دوسرے وزن میں جو پہلے وزن سے ہم آہنگ ہو ۔ زمانۂ حال کے مشہور استادِ فن آرزو لکھنوی نے بھی ایک غزل میں یہ دونوں بحریں استعمال کی ہیں ۔ میں بھی اسے جائز سمجھتا ہوں اور میں نے اپنی نظم " قبرص " کے کچھ شعر فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن اور کچھ شعر فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فع میں لکھے ہیں ۔ میری خواہش ہے کہ اس طریقے کو رواج دیا جائے ۔

؎ اتنا برسا ٹوٹ کے بادل ڈوب چلا میخانہ بھی ۔

یہ ہیں شاعر اور فنِ شعر کے متعلق میرے وہ نظریات جن کا بیان کرنا
اس لئے ضروری تھا کہ قارئینِ کرام میری نظموں کا مطالعہ کرتے وقت انہیں
پیشِ نظر رکھیں۔ اب ہیں چند باتیں اس مجموعے کے متعلق عرض کرنی چاہتا ہوں
اس میں میں نے اپنی صرف وہ نظمیں شامل کی ہیں جن کا تعلق قومی، انسانی
یا عالمی مسائل سے ہے۔ کچھ نظمیں ایسی ہیں جن میں میں نے ان مشاہیر کو
خراجِ تحسین ادا کیا ہے جن کی خدمات اور شخصیتوں نے مجھے متاثر کیا۔
رومانی نظمیں اور غزلیں میں نے اس میں شامل نہیں کیں۔ ان نظموں میں
سے بعض تو دس پندرہ سال قبل لکھی گئی تھیں جیسے "ہم آزاد ہیں"....
"قائدِ اعظم"۔ "شہیدِ ملت"۔ فکرِ فردا، حریفِ غمِ دوراں، نوائے کشمیر،
عزمِ مستقبل، ایسی نظموں کی تعداد کم ہے۔ باقی نظمیں ۱۹۶۵ء کی پاک
بھارت جنگ کے دوران اور کچھ اس کے بعد لکھی گئیں۔ ایسی نظموں کی تعداد
زیادہ ہے۔ ان میں سے کوئی نظم میں نے اپنے اوپر جبر کر کے نہیں لکھی
جب کوئی واقعہ رونما ہوا اور اس سے میرے دل و دماغ متاثر ہوئے
تو خود بخود تحریک پیدا ہوئی اور اشعار صفحۂ قرطاس پر منتقل ہو گئے۔ ہاں
میں نے یہ خیال ضرور رکھا کہ فن کی نزاکتیں مجروح نہ ہونے پائیں۔ البتہ بعض

نظمیں میں نے ضرور ارادۃً لکھیں مگر جبراً نہیں جیسے مشرقی پاکستان، زرعی محاذ
اور میثاقِ استنبول۔

آخر میں میرا خوشگوار فرض ہے کہ اردو زبان کے بزرگ ادیب اور
بالغ نظر نقاد مخدومی جناب ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب صدر دائرہ معارفِ
اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی کا بہ خلوصِ دل شکریہ ادا کروں کہ موصوف نے
علالت کے باوجود اس مجموعے کا مطالعہ کرنے کی زحمت گوارا فرمائی اور اس
پر ایک جامع دیباچہ سپردِ قلم فرمایا۔

لاہور ۱۵/اکتوبر ۱۹۶۷ء　　　　پیام شاہجہان پوری

آزاد ہیں ہم

جہل و افلاس و غلامی کو جلو میں لیکر
ساحلِ ہند پہ قزاق نمودار ہوا
صحنِ گلشن میں ہر اک سمت غبار اُڑنے لگا
خون سے سُرخ ہر اک کوچہ و بازار ہوا

ظلم کے دیو نے ہر سمت علم کھول دیئے

ہر طرف غربت و افلاس کے بادل چھائے

ماؤں کی گود میں معصوموں نے دم توڑ دیئے[1]

اور شہنشاہ کی آنکھوں میں نہ آنسو آئے

تا بہ کے جہل و غلامی کے علم لہراتے

تا بہ کے غربت و افلاس کے آرے چلتے

تا بہ کے ظلم کا عفریت مسلّط رہتا

تا بہ کے چشمِ غریباں میں شرارے پلتے

[1] اشارہ ہے بنگال کے اس قحط کی طرف جس میں لاکھوں افراد بھوک سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گئے اور لاکھوں من غلہ انگریز فوجیوں کے لئے گوداموں میں پڑا سڑتا رہا۔

آخر احساس کے ماتھے پہ شکن آہی گئی

چند دیوانے شہنشاہ سے ٹکرا ہی گئے

جب بپھر اٹھتے ہیں مظلوم بلاتے ہوتے ہیں

آخر ایوانِ حکومت میں شگاف آہی گئے

ملک آزاد ہوا تاجِ شہنشاہی سے

زندہ باد اہلِ وطن اب تو وطن اپنا ہے

پھول اپنا ہے، کلی اپنی، صبا اپنی ہے

نونہالانِ چمن! سارا چمن اپنا ہے

آؤ اے ہم نفسو! عزمِ جواں لے کے اُٹھیں
آؤ سب مل کے کریں اپنے وطن کی تعمیر
پھینک دیں صحنِ چمن سے خس و خاشاک کے ڈھیر
اِک نئے رنگ سے ہو اب کے چمن کی تعمیر

علم کی ضَو سے در و بامِ وطن ہوں روشن
آؤ سب مل کے نئے دور کا آغاز کریں
بے نواؤں کو سلاطین کا ہمسر کر دیں
بے پروں کو بھی عطا قوتِ پرواز کریں

نذرِ وطن

اے نگارِ وطن! میرے پیارے وطن!
تو حسیں، دِل رُبا تیرے کوہ و دمن
تیرے صحرا میں گلزار کا بانکپن
تیرے خاروں پہ قربان سرو سمن
اے نگارِ وطن! میرے پیارے وطن!

تیرا سبزہ زمرّد سے بڑھ کر حسیں
تیری موجِ ہوا مُشکبو، عنبریں
ذرّے ہیرے ہیں، پانی ترا انگبیں
اور سونا اگلتی ہے تیری زمیں
اے نگارِ وطن! میرے پیارے وطن

تیرے فرزند، تیرے جیالے جواں
ان میں ہر ایک طاقت کا کوہِ گراں
ان کے بازو تڑپتی ہوئی بجلیاں
جان بھاری ہو جس کو وہ آئے یہاں
اے نگارِ وطن! میرے پیارے وطن

وقت تجھ بڑے سخت آتے رہے
تیرے بیٹوں کو لوگ آزماتے رہے
تھے یہ آہن صفت مسکراتے رہے
مسکراتے رہے، سر کٹاتے رہے
اے نگارِ وطن! میرے پیارے وطن!

میں پرستار تھا زلف و رخسار کا
حسن موضوع تھا میرے افکار کا
رُخ مگر جب سے بدلا ہے اغیار کا
تو ہے اس دن سے مرکز مرے پیار کا
اے نگارِ وطن! میرے پیارے وطن

اپنے ہر غم کو اب بھول جاؤں گا میں
تیرے غم کو غمِ جاں بناؤں گا میں
تیری تصویر دل میں سجاؤں گا میں
گیت تیری محبت کے گاؤں گا میں
اے نگارِ وطن، میرے پیارے وطن

○

بھارتی حکمرانوں سے

○

یاد آیا میکہ تھا ہندوستاں جنّت نشاں
ہر طرف تھا امن اور انصاف کا سِکّہ رواں

نعمتیں ہر قسم کی تھیں، ان کی ارزانی بھی تھی
مطمئن تھے قلب، دولت کی فراوانی بھی تھی

جرم اگر سلطاں بھی کرتا شومئ تقدیر سے
بچ نہ سکتا تھا کبھی قانون کی تعزیر سے

ہند مسکن تھا اگرچہ مختلف اقوام کا
اور بظاہر کفر پر غلبہ بھی تھا اسلام کا

تھے مسلماں کشورِ ہندوستاں کے تاجدار
جن کی دربانی پہ نازاں تھے ہزاروں شہریار

اللہ اللہ ان کی سطوت، ان کی شانِ سروری
ان کی ہیبت سے لرزتا تھا شکوہِ قیصری

چاہتے تو خون کے دریا بہا سکتے تھے وہ
برہمن کا نام دنیا سے مٹا سکتے تھے وہ

ہے مگر تاریخ شاہد اُن کے لطفِ عام پر
کی نہ خوں ریزی انہوں نے دینِ حق کے نام پر

اور اگر وہ بھی اتر آتے جفاؤ جور پر
آج مل سکتا نہ تھا ہندو دوا کے طور پر

جانتے ہیں سب کہ ان کے عہد میں ایسا نہ تھا
گھنٹیاں بجتی تھیں اور آباد ہر بتخانہ تھا

لیکن اے بھارت کے ہندو حاکمو! سوچا کبھی؟
اپنا چہرہ حال کے آئینے میں دیکھا کبھی؟

ہیں تمہارے ملک پر بربادیاں ظلمت فگن
خیمہ زن ہیں ہر طرف ظلم و ستم، رنج و محن

اک طرف میز و قبائل بر سرِ پیکار ہیں
اک طرف ناگا تمہاری جان کا آزار ہیں

اک طرف ہیں سکھ تمہارے ظلمِ پیہم کا شکار
اک طرف خونِ مسلماں سے ہے دھرتی لالہ زار

بھوک، فاقہ، ننگ، بیماری، تعصب کے شکار
جمع ہیں در پر تمہارے سب قطار اندر قطار

فاقہ کش جب مانگتے ہیں تم سے کھانے کیلئے
تم انہیں دیتے ہو سنگینیں چبانے کے لئے

تھا بُرا بے شک فرنگی، تم سے اچھا تھا مگر
اس کے عہدِ سلطنت میں تھا نہ مذہب[1] کو خطر

(1؎ نوٹ صفحہ ۴۳ پر ملاحظہ فرمائیں)

ہے تمہارے عہد میں اسلام با حالِ تباہ
غیر ہندو کے لئے ہندوستاں ہے قتل گاہ

دندناتے پھر رہے ہیں آج غنڈے چار سو
لٹ رہی ہے آہ مسلم زادیوں کی آبرو

مسجدیں ہیں نذرِ آتش، بتکدے آباد ہیں
پھر بھی کہتے ہو مسلماں ہند میں آزاد ہیں

علم چھینا تم نے اُن سے، ان کی دولت چھین لی
دین چھینا اُن کا، مذہب کی محبت چھین لی

کر دیا گُل اُن کی تہذیب و تمدن کا چراغ
کاٹ ڈالا جڑ سے تم نے ان کی خوشحالی کا باغ

ان کے دسترخوان کی ہر چیز تم نے بین لی
انتہا یہ ہے غریبوں کی زباں تک چھین لی

یاد رکھو ہے ہمیشہ سے یہ قانونِ خدا
ظالموں کا ظلم بڑھ جاتا ہے جب حد سے سوا

دفعتہً مظلوم کی غیرت کو آجاتا ہے جوش
فرطِ غم سے اُڑنے لگتے ہیں ستم رانوں کے ہوش

سر بکف ہو کر نکل آتے ہیں بپھرے نوجواں
پھینک دیتے ہیں چبا کر ظالموں کی ہڈیاں

آج بھارت میں جو برپا ہر طرف کہرام ہے
یہ تمہارے ظلم کا آغازِ بدانجام ہے

باز آجاؤ ابھی بگڑی ہوئی بن جائے گی
ورنہ پھر تاریخ اپنے آپ کو دہرائے گی

○

لہ انگریز یقیناً ہماری آزادی کا دشمن تھا مگر اس نے ہمیں جبراً عیسائی نہیں بنایا، نہ مساجد کی بے حرمتی کی، نہ ہماری عورتوں کو بے آبرو کیا، نہ گئو کشی پر پابندی لگائی۔ ہمیں اپنے مذہب پر عمل کرنے کی پوری آزادی تھی۔ اس شعر میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے (پیام)

مشرقِ پاکستان

○

پاک بنگال! اے جوٹ کی سرزمیں
تیرے منظر ہیں کیسے بہار آفریں

کھیتیاں دھان کی لہلہاتی ہوئی
یہ فضائیں تری مسکراتی ہوئی

نرم ریشے کی دولت لئے کشتیاں
سینۂ بحر پر ہیں مسلسل رواں

مست مانجھی ہے اپنی مدھر تان میں
جیسے گاتا ہو جوگی کوئی دھیان میں

کتنے سندر ہیں کیسے طرح دار ہیں
تیرے بَن ہیں کہ قدرت کے شہکار ہیں

تیرے دریاؤں کی سرکشی کے نثار
جن سے سیکھے کوئی زندگی کے شعار

اُف یہ برکھا کی رُت، یہ سہانا سماں
آرزو دل میں لیتی ہے انگڑائیاں

تیری کس کس ادا کا فسانہ لکھوں
کیوں نہ کہہ دوں تجھے سرزمینِ فسوں

تیرے باسی بھی سندر ہیں تیری طرح
ان کے دل بھی منوّر ہیں تیری طرح

جانِ اخلاص و روحِ محبّت ہیں یہ
سر سے پا تک مجسّم شرافت ہیں یہ

یوں تو ڈرتے نہیں تیر و تلوار سے
جان دے دیں، جو مانگے کوئی پیار سے

فطرتاً ہے تصنّع سے نفرت انہیں
ہے بہت سادگی سے محبت انہیں

گود میں برق و باراں کی پلتے ہیں یہ
آگ سے بن کے کندن نکلتے ہیں یہ

جان و دل کی طرح ہم کو پیارے ہیں یہ
کیوں نہ ہو، دست و بازو ہمارے ہیں یہ

کیا ہُوا دور ہیں دونوں بازو اگر
جسم تو ایک ہے، ایک قلب و نظر

دین دونوں کا ہے ایک، ایمان ایک
ہے نبیؐ ایک دونوں کا، قرآن ایک

ایک مقصود ہے، مدعا ایک ہے
لب پہ دونوں کے حرفِ ندا ایک ہے

اے وطن تجھ کو جنّت بنائیں گے ہم
مانگ تیری گلوں سے سجائیں گے ہم

میثاقِ استنبول

بدل گئے ہیں زمانے کے اب قدیم چلن
نئے بدن پہ نہ آئے گا کہنہ پیراہن

نئی زمیں ہے ، نئے راستے ، نئی منزل
نیا اُفق ہے ، نیا آفتاب جلوہ فگن ،

نیا چمن ہے، نئے پھول، باغباں بھی نئے
نئی ادا سے سجایا بہار نے گلشن

وہ انقرہ ہو کہ طہران ہو کہ ہو لاہور
ہر اک جگہ ہے محبت کی کہکشاں روشن

ہے ایک دل جو دھڑکتا ہے تین سینوں میں
ہے ایک روح کہ زندہ ہیں جس سے تین بدن

نہ فاصلے ہیں، نہ باقی رہی فصیل کوئی
جنوں نے توڑ دیئے رنگ و نسل کے بندھن

قدم ملا کے چلے سوئے منزلِ مقصود
ہے سب کی ایک تمنا ہے سب کو ایک لگن

کہیں بھی ظلمت و افلاس کا نشاں نہ رہے
چراغ امن و مسرت ہوں ہر طرف روشن

یہ اتحادِ ثلاثہ نہیں ہے حرفِ تمام
بہت دراز ہے مہر و خلوص کا دامن

جلی ہے شمع تو آئیں گے اور پروانے
صبا چلی ہے تو مہکیں گے اور بھی گلشن

شکستِ شب

○

شہر چپ چاپ تھا، گاؤں خاموش تھے
قافلے منزلوں سے ہم آغوش تھے

رات تاریک تھی، سخت گمبھیر تھی
سخت تاریک مانندِ کشمیر تھی

لوگ تھے خوابِ شیریں میں کھوئے ہوئے
شاہراہوں پہ اشجار سوئے ہوئے

وادیاں، ندّیاں، کھیتیاں، گلستاں
ہر طرف تھا خموشی کا سکّہ رواں

عین اس وقت سفاک چوروں کے غول
بزدلوں، ڈاکوؤں، مردہ خوروں کے غول

دل میں ناپاک ارادوں کا طوفاں لئے
سرحدِ پاک کی سمت بڑھنے لگے

شیطنت نے شرافت پہ حملہ کیا
ملک و ملت کی غیرت پہ حملہ کیا

شعلے توپوں کے منہ سے نکلنے لگے
گاؤں پھُنکنے لگے، کھیت جلنے لگے

لوٹ مچنے لگی، شہر اجڑنے لگے
ماؤں سے ان کے بچے بچھڑنے لگے

ایک شوہر سے جانِ وفا چھن گئی
ایک بیٹی کے سر سے ردا چھن گئی

پٹ گئیں مردہ جسموں سے پگڈنڈیاں
خون بہنے لگا مثلِ آبِ رواں

قافلہ شب کا جب تک رہا خیمہ زن
چاک ہوتا رہا امن کا پیرہن

لیکن ابھرا جو خورشیدِ ظلمت شکار
جامۂ ظلم ہونے لگا تار تار

یوں بڑھا لشکرِ پاک دشمن کی سمت
برق جیسے لپکتی ہے خرمن کی سمت

سر بکف، تیغ زن، عزمِ نصرت لئے
ہر جواں دل میں شوقِ شہادت لئے

ذکر کرتا بڑھا، والہانہ بڑھا
مثلِ ضیغم بڑھا، فاتحانہ بڑھا

رن پڑا اور پڑا اس قیامت کا رن
کانپ اٹھی خوف سے ارضِ گنگ و جمن

جس طرف پاک فوجوں کے غازی مُڑے
فیل تن ٹینکوں کے پرخچے اُڑے

جنگ کا بھوت تھا جن کے سر پر سوار
اب انہیں مل رہی تھی نہ راہِ فرار

جو ہمارے لہو کے طلبگار تھے
ان کی لاشوں کے ہر سمت انبار تھے

گر رہے تھے جہاز ان کے یوں منہ کے بل
جیسے آندھی میں گرتے ہیں شاخوں سے پھل

شیر خواروں پہ جھپٹے تھے جو مثلِ شیر
غازیوں کے مقابل تھے مٹی کے ڈھیر

ضربتِ لا الٰہ کارگر ہوگئی
چھٹ گیا ابرِ ظلمت سحر ہوگئی

السّلام اے وطن کے بہادر جواں!
السّلام اے ہوا بازِ رفعت نشاں!

السّلام اے شہیدانِ عالی مقام
ہوگیا تم سے رخشندہ ملّت کا نام

ابرِ رحمت سدا تم پہ چھایا رہے
اور ہمیشہ فرشتوں کا سایہ رہے

اہلِ پاکستان

○

آگ اور خون کا اک سیلِ رواں ہیں ہم لوگ
حق میں دشمن کے ہلاکت کا نشاں ہیں ہم لوگ

حادثے ہم سے گریزاں ہیں، اجل رُو گرداں
سر بکف، شعلہ فشاں، برقِ تپاں ہیں ہم لوگ

ہو اگر بزم تو ہیں پھول کی پتی کی طرح
عرصۂ جنگ میں شمشیر و سناں ہیں ہم لوگ

ہم جو بڑھتے ہیں تو سیلابِ بلا ہوتے ہیں
اور رُک جائیں تو اک کوہِ گراں ہیں ہم لوگ

موت کا دیو جہاں رقص کناں ہے لوگو!
آؤ دیکھو کہ وہاں زمزمہ خواں ہیں ہم لوگ

یہ فضائیں، یہ اڑانیں، یہ عزائم، یہ عروج[1]
آج ہم مرتبۂ کاہکشاں ہیں ہم لوگ

اپنی تاریخ لکھی اپنے لہو سے جس نے
ہاں اسی قوم کے جی دار جواں ہیں ہم لوگ

([1] اشارہ ہے پاک فضائیہ کے شیر دل ہوا بازوں کی طرف۔)

ہم کو للکار نہ اے دشمنِ روباہ صفت
شیرِ یزداں ہیں، شجاعت کا نشاں ہیں ہم لوگ

ہم بڑے سخت ہیں جب جوش میں آ جاتے ہیں
ہڈّیاں دشمنِ بدخو کی چبا جاتے ہیں

عظمت کے چراغ

ستمبر ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں پاکستانی افواج کے ان بہادرانہ کارناموں سے متاثر ہو کر جنہیں آنے والی نسلیں فخر سے یاد کریں گی،

کارنامہ وہ شجاعت کا دکھایا تم نے
بابِ تاریخ میں اک اور بڑھایا تم نے

نازِ دشمن کو بہت کثرتِ افواج پہ تھا
خاک میں اس کے تکبّر کو ملایا تم نے

سازو ساماں نہیں، ایماں ہے مدارِ نصرت
معجزہ پھر یہ زمانے کو دکھایا تم نے

برق جیسے خس و خاشاک کو کرتی ہے بھسم
اس طرح خرمنِ باطل کو جلایا تم نے

کچھ بھی غیرت ہے تو لے گا نہ کبھی جنگ کا نام
وہ مزا دشمنِ سرکش کو چکھایا تم نے

تم نے چھوڑا نہ کسی حال میں دامانِ وقار
زخم کھایا بھی تو سینے ہی پہ کھایا تم نے

کامیابی نے قدم چومے تمہارے ہر سو
ہر طرف فتح کا نقارہ بجایا تم نے

خونِ دشمن سے ہے گل رنگ زمینِ دشمن
کیا چمن سینۂ صحرا پہ کھلایا تم نے [۱]

ڈٹ گئے سامنے دشمن کے چٹانوں کی طرح
پھر نہ میداں سے قدم پیچھے ہٹایا تم نے

آج روشن ہیں اسی خون سے عظمت کے چراغ
چھ ستمبر کو جو سرحد پہ بہایا تم نے

اے شہیدانِ وفا! تم پہ خدا کی رحمت
راستہ قوم کو عزت کا دکھایا تم نے

تا ابد زندہ و پائندہ رہو گے تم لوگ
راز مر کر ہمیں جینے کا بتایا تم نے

[۱] اشارہ ہے راجستھان کی جنگ کی طرف جہاں بھارتی فوجیں اپنے بے شمار زخمی اور مقتول سپاہیوں کو چھوڑ کر میدان سے فرار ہو گئی تھیں۔

نوجوانانِ وطن سے

○

جوہرِ کردار کی تفسیر فرماتے چلو
حادثاتِ دہر میں ہنستے چلو، گاتے چلو

اپنی کشتی اس جگہ لے جاؤ، طوفاں ہو جہاں
زندگی طوفان ہے، طوفاں سے ٹکراتے چلو

چند سینوں میں اگر سوزِ تمنا ہے تو کیا
سب کے سینے شوق کی آتش سے گرماتے چلو

قافلہ ہو تیز رو، ایسی حدی خوانی کرو
سازِ دل پر نغمۂ آتش نفس گاتے چلو

اپنے گلشن میں چلو مثلِ نسیمِ جاں فزا
خرمنِ اعدا پہ مثلِ برق لہراتے چلو

سیم و زر زنجیر ہیں مردانِ غازی کیلئے
راہ کے پتھر ہیں یہ تم ان کو ٹھکراتے چلو

دردِ دل دولت ہے، جس کو مل گئی سلطاں ہوا
تم بھی سلطاں ہو، یہ دولت عام فرماتے چلو

نفس کے بندوں سے دُنیا خانۂ تاریک ہے
خدمتِ انسانیت کا نور پھیلاتے چلو

سان پر چڑھنے ہی سے آتی ہے تلواروں میں کاٹ
مشکلوں میں گھر کے جوہر اور چمکاتے چلو

بازوؤں میں جن کے قوت ہو یہ دنیا ان کی ہے
یہ حقیقت قوتِ بازو سے منواتے چلو

یہ مہ وانجم تو کیا خورشید بھی ہوگا اسیر
راستوں کو علم وفن کی ضو سے چمکاتے چلو

○

نوائے کشمیر

○

جلو میں آگ کے طوفان لے کے چلتی ہے
مرے وطن کے جوانو! ہوا بدلتی ہے

جھلس رہے ہیں گلستانِ وادیٔ کشمیر
بڑے غضب کی ہوائے سموم چلتی ہے

وہ قوم لے کے جو نکلی تھی حرّیت کا پیام
گلے پہ اس کے غلامی کی تیغ چلتی ہے

وہ سرزمیں گلِ صد رنگ جو اگاتی تھی
ستم ستم!! وہ زمیں اب لہو اُگلتی ہے

وہ قوم جس کی متاعِ عزیز تک چھن جائے
کہیں وہ دامنِ آسودگی میں پلتی ہے؟

اٹھو! کہ دامنِ مِلّت پہ داغ آتا ہے
اٹھو! کہ غیرتِ اسلاف ہاتھ ملتی ہے

چراغِ کعبہ، برہمن بجھائے دیتا ہے
خدا کے گھر کو شوالہ بنائے دیتا ہے

پاک فضائیہ

○

اے بلندی کے مکینو! آسماں کے ہمسرو!
بجلیوں کے رازدانو! اے ہوا کے رہبرو!

تم محافظ ہو وطن کے تم پہ نازاں ہے وطن
ہے تمہارے شعلۂ جرأت سے روشن انجمن

تم ہو جن کی آسماں نے سروری تسلیم کی
خود حریفوں نے تمہاری برتری تسلیم کی

روند ڈالا تم نے دشمن کے غرور و ناز کو
کر دیا مفلوج اس کی طاقتِ پرواز کو

بھاگتے تھے دیکھ کر یوں تم کو دشمن کے جہاز
جیسے اڑتے ہوں کبوتر اور جھپٹے شاہباز

مثلِ برقِ بے اماں برباد کُن ہر وار تھا
جو تمہاری زد میں آیا راکھ کا انبار تھا

کودتے تھے اس طرح تم آگ کے طوفان میں
جیسے کوئی کھیلتا ہو کھیل کے میدان میں

جس طرف بھی رُخ کیا، دشمن کے طیارے گرے
موت لائی، شامتِ اعمال کے مارے گرے

اے وطن کے شاہبازو! زندہ و پائندہ باد
غیرتِ ملی سلامت، جوشِ ایماں زندہ باد

دُودھ پر جن کے پلے اُن نیک ماؤں کو سلام
اپنی ملت سے جو کی ہیں ان وفاؤں کو سلام

دوش پر اڑتے ہو جن کی ان ہواؤں کو سلام
جن پہ قبضہ ہے تمہارا ان فضاؤں کو سلام

جس سے تم آتش بجاں ہو اس حرارت کو سلام
کانپ اٹھا جس سے دشمن اس شجاعت کو سلام

عزمِ محکم کا نشاں، قوت ہو تم ایمان کی
سچ تو یہ ہے لاج رکھ لی تم نے پاکستان کی

○

زرعی محاذ

○

دنیا بدل رہی ہے نئے اس کے ڈھنگ ہیں
اس عہد میں طریقِ کہن وجہِ ننگ ہیں

ہر شعبۂ حیات ترقی پذیر ہے
ہر شے سے آشکار تغیّر کے رنگ ہیں

اب جا رہا ہے چاند کی وسعت کو ناپنے
دنیا کی وسعتیں بنی آدم پہ تنگ ہیں

تسخیرِ آسماں کو اٹھا ہے زمین سے
اہلِ فلک بشر کی جسارت پہ دنگ ہیں

اک موت، اک حیات، انہی دو کے ماسوا
حاوی ہر اک چیز پہ اہلِ فرنگ[۱] ہیں

بارش پہ دسترس ہے، زمیں کے مزاج داں
کب ان پہ اختراع کے میدان تنگ ہیں

لیکن مرے وطن کے زمیندار، الاماں
ان کے وہی طریق، وہی رنگ ڈھنگ ہیں

[۱] اہلِ فرنگ بہ طورِ استعارہ استعمال ہوا ہے۔ مراد مغرب کی ترقی یافتہ اقوام ہیں۔

دو بیل، اک قدیم زمانے کا ہل لئے
بنجر زمیں کے سینے پہ مصروفِ جنگ ہیں

اس طرح ہو گی قوم گدائی سے بے نیاز؟
پوچھے بھلا کوئی یہ پنپنے کے ڈھنگ ہیں

دشمن کھڑا ہے سر پہ نبرد آزمائی کو
کشمیر کے ستم زدہ جینے سے تنگ ہیں

اٹھ اے کسان! تو بھی سپاہی ہے قوم کا
سوچے اگر تو کھیت بھی میدانِ جنگ ہیں

کشمیر جل رہا ہے

○

اے مرے کشمیر! اے دلکش نظاروں کی زمیں
اے چناروں کے وطن! اے کوہساروں کی زمیں

اے مرے فردوسِ ارضی! اے بہاروں کے وطن
گنگناتے، رقص کرتے آبشاروں کے وطن

تیرے پھولوں، تیری کلیوں، تیرے غنچوں کے نثار
تیری بادِ نرم کے پُر لطف جھونکوں کے نثار

جھیل ڈل کے سرد و لذت بخش پانی کے نثار
تیرے رنگیں طائروں کی نغمہ خوانی کے نثار

تیرے میدانوں میں رقصاں ہے شبابِ زندگی
نغمہ زن ہے تیرے جھرنوں میں ربابِ زندگی

مرغزاروں میں ہے تیرے روئے فطرت بے نقاب
تیرا ہر گلزار ہے گلزارِ جنت کا جواب

تیرے چشموں سے اُبلتا ہے جوانی کا خمار
کھینچتے ہیں حسن کی تصویر تیرے لالہ زار

یہ تو سب کچھ ہے مگر اے خطۂ جنّت نشاں!
ہے جہنم تیرے بیٹوں کے لئے تیرا جہاں

آج تجھ پر ڈاکوؤں اور غاصبوں کا راج ہے
ایک اک دانے کو ہر بیٹا ترا محتاج ہے

تیرے فرزندوں پہ ٹوٹے وہ مظالم الاماں!
پھونک ڈالیں ظالموں نے بستیوں کی بستیاں

ظلم کا آئین نافذ ہے ترے گلزار پر
ہر طرف لاشیں ہیں آویزاں حسیں اشجار پر

جن کے سینوں پر چلی ہیں برچھیاں قانون کی
تیرے پھولوں میں یہ سرخی ہے انہیں کے خون کی

کٹ رہے ہیں قتل گہ میں بے خطا تیرے جواں
سہمی سہمی پھر رہی ہیں آہ تیری بیٹیاں

رقص کرتے ہیں شیاطیں سایۂ تلوار[1] میں
لٹ رہی ہیں عصمتیں ہر کوچہ و بازار میں

ظالموں کے سامنے ہوتے ہیں جو سینہ سپر
اُن پہ کھل جاتے ہیں فوراً تیرے زندانوں کے در

اس زمیں پر اپنے دل کی بات کہنا جرم ہے
اہلِ حق کا اس فضا میں زندہ رہنا جرم ہے

لیکن اے کشمیر مت گھبرا کہ تیرے جاں نثار
جان دے کر بھی بچائیں گے ترا حسنِ بہار

[1] اس ترکیب کے متعلق "معروضاتِ شاعر" کے زیرِ عنوان صفحہ ۲۳ پر اظہارِ خیال کر چکا ہوں۔ پیام

ان کے بازو ہیں قوی، ان کی حمیت زندہ ہے
ان کا ایماں ہے سلامت، ان کی غیرت زندہ ہے

ان کے سینے شدتِ[1] طوفان سے پُرجوش ہیں
تیرے سب بیٹے تیری خاطر کفن بردوش ہیں

موجزن ہے ان کے سینوں میں وہ جوشِ انتقام
پُرزے پُرزے کرکے چھوڑیں گے یہ طاغوتی نظام

رہ گئے ہیں دن بہت کم شدتِ آفات کے
بھاگنے والے ہیں ہرکارے اندھیری رات کے

پھٹ رہی ہے پَو، یہ قصہ مختصر ہونے کو ہے
اے شبِ کشمیر! اب تیری سحر ہونے کو ہے

[1] اس ترکیب کے متعلق "معروضاتِ شاعر" کے زیرِ عنوان صـ۲۳ پر اظہارِ خیال کر چکا ہوں۔

عزمِ مستقبل

ہمیں یقیں ہے یہ میدان ہم ہی ماریں گے
وہ ہم نہیں ہیں جو اس کشمکش میں ہاریں گے

چمن پہ حق ہے انہی کا وہی ہیں اہلِ چمن
جو ہر کلی کو ہر اک پھول کو نکھاریں گے

یہ اُجڑے اُجڑے سے چہرے، پھٹے پھٹے یہ لباس
عروسِ زیست کی زلفیں یہی سنواریں گے

نہ سُرخ ہو رخِ ہستی تو بات ہی کیا ہے
ہم اپنے خونِ جگر سے اسے نکھاریں گے

ق

ترا جمال بھی ہم کو عزیز ہے، تو بھی
نہ سوگوار ہو، تجھ پہ بھی جان واریں گے

پلٹ آئیں گے جب کارزارِ ہستی سے
تو چند لمحے ترے ساتھ بھی گذاریں گے

پیام! اس کی محبت کا فرض ہے ہم پر
ملی جو فرصتِ دوراں تو پھر اتاریں گے

○

پاک بحریہ

اے پاک بحریہ کے جوانو! تمہیں سلام
اونچا کیا ہے تم نے ہمارے وطن کا نام

امواجِ خوں فشاں کے شناور تمہی تو ہو
کرتا ہے ناز جن پہ سمندر تمہی تو ہو

موجیں غلام، تابعِ فرماں نہنگ ہیں
طوفاں تمہارے جوشِ فراواں پہ دنگ ہیں

سینے پہ تم بھنور کے خراماں ہو اس طرح
پھرتا ہو کوئی صحنِ گلستاں میں جس طرح

اللہ رے جلال تمہارے وقار کا
اب تک لرز رہی ہے زمینِ دوارکا

اپنی دلاوری کے وہ سکے جمائے ہیں
دشمن کی بحریہ کے پرخچے اڑائے ہیں

ہر چند موج موج اسے تم نے دی صدا
غیرت بہت دلائی کہ ہو پنجہ آزما

بزدل تھا سر کٹانے پہ مائل نہ ہو سکا
دشمن تمہارے مدِ مقابل نہ ہو سکا

للکارتے ہیں آج بھی ضیغم[۱] کھڑے ہوئے
ہیں بحر پر تمہارے ہی جھنڈے گڑے ہوئے

○

۱ پاک بحریہ کے جہاز مراد ہیں۔

روحِ قائدِ اعظمؒ کا مِلّت سے خطاب

○

یاد آیا ہے کہ تم میں تھا نہ کوئی راہ داں
منزلوں تک تم کو ملتا تھا نہ منزل کا نشاں

حادثے، طوفاں، تصادم، زلزلے، بربادیاں
ان مصائب سے الجھتا جا رہا تھا کارواں

راستے پُرپیچ و وحشتناک، ساتھی مضمحل
پھر قیامت یہ کہ رہزن تھے شریکِ کارواں

چل رہا تھا میں بھی لیکن کارواں سے دور دور
کارواں سے دور رہ کر بھی شریکِ کارواں

میرے پہلو میں بھی دل تھا سنگ پارہ تو نہ تھا
سوز سے پُر ہو گیا آخر کو میرا سازِ جاں

نغمۂ آتش نفس سینے سے لب پر آ گیا
لب پہ آیا اور چونک اٹھے شریکِ کارواں

یاد تو ہو گا وہ نکتہ جو بتایا تھا تمہیں
جب بنایا تھا مجھے تم نے امیرِ کارواں

منزلِ مقصود پوشیدہ اسی نکتے میں ہے
اتحادِ باہمی، محکم یقیں، عزمِ جواں

اور پھر دیکھا تھا کتنی مشکلوں کے باوجود
ہٹ گئے تھے راستے سے سیکڑوں سنگِ گراں

قائدِ ملّت کی شہادت کے بعد

آہ لیکن دیکھتا ہوں آج جب سوئے وطن
میری روحِ ناتواں پر کوندتی ہیں بجلیاں

اپنے ہاتھوں قوم اپنے محسنوں کو مار دے
اس سے بڑھ کر اور کیا ہے تیرہ بختی کا نشاں

آہ وہ بدبخت ملت، ہائے وہ بدبخت ملک
کام جس کے رہنماؤں کا ہو سودے بازیاں

مسندِ قانون سازی قوم نے دی ہو جنہیں
ان کے ہاتھوں سے اڑیں قانون کی یوں دھجیاں

قتل کر دیں اپنے قائد[1] کو بھرے ایوان میں
ایسے ایواں پر نہ ٹوٹیں آسماں سے بجلیاں؟

اس کا چہرہ خوف سے افسردہ و پژمردہ ہو
قوّتِ بازو سے جس کی لہلہائیں کھیتیاں

اک طرف مفلس کی کٹیا شام سے تاریک ہو
اک طرف محلوں میں روشن ہوں سحر تک شمع داں

[1] مشرقی پاکستان اسمبلی کے ڈپٹی اسپیکر کے قتل کی جانب اشارہ ہے۔

اک طرف بیکس ضعیفہ ہو اسیرِ رنج و غم
اک طرف آزاد ہنستی کھیلتی شہزادیاں

کون کہتا ہے یہ میرے کارواں کے لوگ ہیں؟
یوں مرتب کب کیا تھا میں نے اپنا کارواں؟

۱۹۵۸ء کے پُرامن انقلاب کے بعد

زندہ باد اہلِ وطن خورشیدِ نو ظاہر ہوا
چھٹ رہی ہیں اب غم و اندوہ کی تاریکیاں

آ گئی ہے اہل ہاتھوں میں عنانِ سلطنت
اب نہ ہوگی میری میراثِ مقدس رائیگاں

سازشوں پر اب نہیں ہوگا سیاست کا مدار
اب نہ راتوں رات بدلی جا سکیں گی کرسیاں

دیکھتا ہوں میں کہ دیوارِ چمن مضبوط ہے
اب نہ آئے گا خزاں کی زد میں اپنا گلستاں

اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے دن آنے لگے
اب نہ رہنے پائیں گی محتاجیاں معذوریاں

ہو مبارک دن زمینِ شور کے بھی پھر گئے
مسکراتے ہیں گلستاں، جھومتی ہیں کھیتیاں

جو زمیں کو بار آور کر کے بھی محتاج تھا
اب وہ پیدا کر رہا ہے آپ ہی اپنا جہاں

علم و فن کی مشعلیں روشن ہوئیں چاروں طرف
جادہ پیما ہو رہا ہے عزمِ نو سے کارواں

معمارِ ملت سے خطاب

لیکن اے معمارِ ملت! ہو نہ جانا مطمئن
ہیں ابھی کچھ ماضیٔ مرحوم کے باقی نشاں

جس قدر ہو جلد ممکن ان کے رخ پہچان لے
ہیں بہت سے راہزن[1] اب بھی شریکِ کارواں

دامنِ ملت پہ اب بھی داغ کچھ موجود ہیں
کچھ خس و خاشاک باقی ہے چمن کے درمیاں

[1] اشارہ ہے سماج دشمن عناصر اور فرض ناشناس حکام کی طرف۔ (پیام)

ابرپاروں سے نہ جب تک آسماں بالکل ہو صاف
جگمگائے بھی تو کیسے جگمگائے کہکشاں؟

رہ گئے ہیں چند کانٹے اُٹھ انہیں بھی توڑ دے
میری خواہش ہے کہ ہو رشکِ ارم یہ گلستاں

نقش ہر ذرّے پہ استحکام کی تصویر ہو
میرا پاکستان میرے خواب کی تعبیر ہو

حریفِ غمِ دوراں

پابندِ رہ و رسمِ بہاراں نہ ہوئے ہم
گلشن میں کبھی چاک گریباں نہ ہوئے ہم

کسی روز حوادث سے نہ چشمک رہی اپنی
کسی روز حریفِ غمِ دوراں نہ ہوئے ہم

کب تیرے تغافل کی شکایت ہوئی ہم سے
کس دن تری محفل میں غزل خواں نہ ہوئے ہم

کچھ غم نہیں دامن ہے اگر چاک ہمارا
خوش ہیں کبھی شرمندۂ احساں نہ ہوئے ہم

کرتے رہے آرائشِ گیسوئے بہاراں
ہرچند ہم آغوشِ بہاراں نہ ہوئے ہم

ہر حال میں قائم ہے وہی شوخیٔ گفتار
طوفانِ حوادث میں بھی گریاں نہ ہوئے ہم

کہتا تھا گلِ گلستاں میں یہ داغِ دلِ لالہ
صد حیف کہ داغِ دلِ انساں نہ ہوئے ہم

آزاد کشمیر

ایک قومِ نکتہ پرور، نکتہ داں، صاحب نظر
اہلِ حکمت، اہلِ دانش، اہلِ علم، اہلِ ہنر

ایک قومِ ذی شرف، ذی مرتبہ، عالی دماغ
جس نے تہذیب و تمدن کے جلائے تھے چراغ

شاطرِ مغرب کے ہاتھوں ہو گئی مجبور و خوار
لے گیا اک ڈوگرہ اس کی قبائے زرنگار

اک صدی تک اس پہ وہ ظلم و ستم ہوتے رہے
اس کے حالِ زار پر افلاک بھی روتے رہے

کچھ بھی ہو اک قومِ غیرتمند کے افراد تھے
جسم تھے محکوم بے شک دل مگر آزاد تھے

لے کے اک انگڑائی میدانِ عمل میں آ گئے
بن کے طوفاں قصرِ استبداد سے ٹکرا گئے

ایک ہی یورش میں غالب آ گیا باطل پہ نور
مل گیا مٹی میں سارا ڈوگرہ شاہی غرور

گونج اُٹھا زندانیوں میں غلغلہ تکبیر کا
ہو گیا آزاد خطّہ ایک تو کشمیر کا

شمع روشن ہو گئی ہے تیرگی چھٹ جائے گی
یہ غلامی کی شبِ تاریک اب کٹ جائے گی

ہے یہ مسکن قوم کے ان سرفروش افراد کا
جن کی آنکھیں ہیں عقابی اور دل فولاد کا

ان کے سینے عشق کے انوار سے پُر نور ہیں
ان کے دل شوقِ شہادت سے بہت مسرور ہیں

اب یہی خطّہ بنے گا مرکزِ آزادگاں
ہاں اسے خطے سے اُٹھے گا وہ سیلِ بے اماں

اپنی رَو میں جو چٹانوں کو بہا لے جائے گا

بے نشاں ہو جائے گا، جو اس کی زد میں آئے گا

○

فکرِ امروز

○

اس قوم پہ ہوتے ہیں عیاں زیست کے اسرار

جو قوم رہے موت سے آمادۂ پیکار

سمجھو کہ ہے ظلمت فگن اس قوم پہ ادبار

احساس سے محروم ہوں جب قوم کے زردار

بے فکر نہ ہو باغ کے معصوم پرندو
ہر شاخ سے آتی ہے مجھے سانپ کی پھنکار

ہو ذوق تو ہے درد میں اک لذتِ پنہاں
یہ پوچھیے ان سے جو ہیں لذت کشِ آزار

ہونے دے نہ کم سوزِ تمنا کی حرارت
قائم ہے اسی شے سے یہاں گرمئ بازار

قیمت دلِ پُرشوق کی مشکل سے اُٹھے گی
اِس جنسِ گراں مایہ کے ہیں کم ہی خریدار

قومیں کبھی افلاس کے ہاتھوں نہیں مٹتیں
قوموں کو مٹا دیتی ہے ناداریٔ افکار

ہے خوب یہ بیداریٔ شب زاہدِ مرتاض!
لیکن یہ بتا! روح بھی تیری ہوئی بیدار؟

○

مجاہدینِ کشمیر کا نغمۂ آزادی

○

نشیمن برق کی زد میں بنانا ہم کو آتا ہے
نگاہیں قیصر و جم سے ملانا ہم کو آتا ہے

گواہی دے رہا ہے گلشنِ کشمیر کا ہر گل
تہِ تیغ و سناں بھی مسکرانا ہم کو آتا ہے

زمینِ شور میں بوتے ہیں تخمِ آرزو پہلے
پھر اس سے لہلہاتی فصل اٹھانا ہم کو آتا ہے

ہمیں سے ہو گی ہم آغوش اب لیلائے آزادی
کہ زنجیروں کی لے پر گیت گانا ہم کو آتا ہے

ہمیں اپنے لہو سے غسل کرنا ہی نہیں آتا
حریفوں کے لہو میں بھی نہانا ہم کو آتا ہے

ہمیں بپھرے ہوئے طوفاں سے گھبرانا نہیں آتا
سمندر میں لہو کے تیر جانا ہم کو آتا ہے

صدائیں آ رہی ہیں وادیٔ گلمرگ سے اب تک
دلوں پر زخم کھا کر مسکرانا ہم کو آتا ہے

ہمیں کاٹیں گے زنجیریں، ہمیں توڑیں گے دیواریں
کہ اپنی جان پر بھی کھیل جانا ہم کو آتا ہے

چراغِ حُرّیت کی لو ذرا کم ہو نہیں سکتی
یہ گردن کٹ تو سکتی ہے مگر خم ہو نہیں سکتی

○
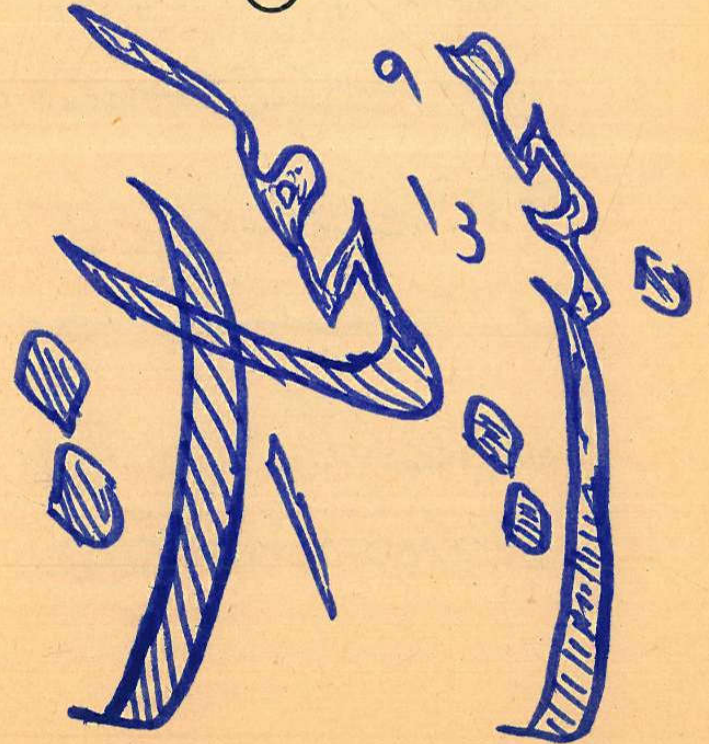
نوائے تلخ

○

موجیں ہیں بلاخیز، بہت تُند ہوا ہے
عربوں کا جہاز آج تلاطم میں گھرا ہے

ہے دیر و کلیسا میں بپا جشنِ چراغاں
اور عالمِ اسلام میں کہرام مچا ہے

مغضوب تھی، معتوب تھی جو قوم جہاں میں
اب ارضِ مقدس پہ علم اس کا گڑا ہے

ٹوٹے ہیں مظالم کے پہاڑ اہلِ عرب پر
پانی کی طرح خون غریبوں کا بہا ہے

لوٹے گئے اس طور سے بستے ہوئے قریے
باقی کسی گھر میں کوئی تنکا نہ رہا ہے

برسی ہے یہاں آگ قیامت کی نہ پوچھو
تا حدِ نظر راکھ کا انبار لگا ہے

مٹتے ہیں مقابر، کہیں گرتی ہیں مساجد
حسرت سے مسلمان کھڑا دیکھ رہا ہے

پہلے ہی اس امت کا بدن تھا تنِ خستہ
یہ زخم نیا سینۂ ملت پہ لگا ہے

اس زخم کی بھی چارہ گری کر مرے مولیٰ
کہتے ہیں کہ ہر درد کی دنیا میں دوا ہے

اغیار کے قبضے میں گئی مسجدِ اقصیٰ
اے قاہر و جبّار! کہاں روزِ جزا ہے؟

ناگاہ صدا آئی کہ اے شاعرِ بیدار!
بے شک ترا افسانہ بڑا درد بھرا ہے

گذری ہے جو عربوں پہ ہم اس سے نہیں غافل
اس ظلم سے ہم کو بھی بہت رنج ہوا ہے

فطرت ہی میں داخل ہے یہودی کی خصومت
پیکر ہی یہودی کا شرارت سے بنا ہے

نفرت سے، تعصّب سے، عداوت سے، دغا سے
ان چار عناصر سے خمیر اس کا اٹھا ہے

یہ ظلم سے باز آئے کبھی ہو نہیں سکتا
یہ "وصف" تو اس قوم کو ورثے میں ملا ہے

کیا اس کے مظالم کی سناتا ہے کہانی
اس نے تو ہلاک اپنے رسولوں کو کیا ہے

رونا ہے تو اس قوم پہ رو جس کے اکابر
کہتے تھے کہ مضمر اسی نسخے میں شفا ہے

"تریاق ہے عربوں کے لئے درس وطن کا
پوشیدہ اسی درس میں عربوں کی بقا ہے

مذہب ہے الگ چیز، سیاست ہے الگ چیز
منزل بھی جدا، راہ بھی دونوں کی جدا ہے"

یہ تھا وہ تصوّر جو بنا وجہِ تباہی
مت بھولو کہ اسی فکرِ غلط کا یہ صلہ ہے

کیا خوب کہا ہے یہ مراکش کے حسن نے
عربوں کی شکست ان کے گناہوں کی سزا ہے

کہہ دے ابھی موقع ہے، سنبھل جاؤ وگرنہ
جو وقت اب آتا ہے وہ اس سے بھی بُرا ہے

سب دوڑ کے رسّی مری مضبوط پکڑ لو
اے اہلِ عرب اس میں تمہارا ہی بھلا ہے

دے دے یہ بشارت کہ تمہی ہو گئے ظفریاب
حامی ہے نبیؐ اور نگہباں خداؐ ہے

○

اسرائیل

○

فائدہ یلغارِ اسرائیل سے اتنا ہوا
آگیا ہے یاد ہم کو پھر سبق بھولا ہوا

وہ یہودی ہو، نصاریٰ ہو، برہمن زادہ ہو
ہر جگہ ہے کفر حق کی گھات میں بیٹھا ہوا

ہے تنِ ملّت پہ اک پھوڑا یہودی سلطنت
سینۂ مشرق پہ اک ناسور ہے رِستا ہوا

ہے عبث اقوامِ مغرب سے امیدِ انصاف کی
یہ ستم گر ہے انہی کی گود کا پالا ہوا

کرچکی اس زخم کا اقوامِ متحدہ علاج
اس کے مرہم سے تو گھاؤ اور بھی گہرا ہوا

کوئی پوچھے تو اطبائے سیاست سے یہ بات
ایسا پھوڑا آج تک مرہم سے بھی اچھا ہوا؟

ہو نہیں سکتا بجز نشتر زنی اس کا علاج
ہے یہ نسخہ شیخ[1] کے قانون[2] میں لکھا ہوا

[1] شیخ الرئیس بو علی سینا [2] شیخ کی شہرۂ آفاق تصنیف "القانون فی الطب"

بچ نہیں سکتے یہودی کیفرِ کردار سے
ہو نہیں سکتا غلط قرآن کا فرمایا ہوا

غرق ہوگی اک نہ اک دن بحرِ عقبہ میں یہ ناؤ
مٹ نہیں سکتا کبھی تقدیر کا لکھا ہوا

○

شاہ حسین

خاکِ اُردن سے درخشندہ وہ گوہر نکلا
مطلعِ شرق سے خورشید بھی ششدر نکلا

قصرِ شاہی سے نکل کر سرِ میداں پہنچا
اور میداں میں پہنچ کر سرِ لشکر نکلا

دردِ ملت نے پھرایا تجھے ملکوں ملکوں
اپنے سینے میں چھپائے ہوئے محشر نکلا

اپنے بھائی کو منانے کے لئے خود پہنچا
آفریں تجھ پہ کہ دل کا بھی تونگر نکلا

عشقِ دیں، غیرتِ اسلام، شجاعت، اخلاص
واہ سینہ ترا گنجینۂ گوہر نکلا

اہلِ خرقہ ہی پہ موقوف نہیں صدق و صفا
پادشاہوں میں بھی اک مردِ قلندر نکلا

کتنے طوفان تھے پوشیدہ تری کشتی میں
لوگ قطرہ جسے سمجھے تھے سمندر نکلا

لاج عربوں کی تری فوج نے رکھ لی ورنہ
لوگ کہتے کوئی ان میں نہ دلاور نکلا

جان دے دی تو کہیں شہرِ وفا کو چھوڑا
جو بھی نکلا ترا جانباز وہ مر کر نکلا

رستم و سام تو قصے ہیں مگر شاہ حسین
حق تو یہ ہے کہ حقیقت میں دلاور نکلا

○

قبرص

○

لوٹ مچی ہے قریہ قریہ، آگ لگی ہے بستی بستی
خونِ مسلماں اتنا ارزاں؟ جانِ مسلماں اتنی سستی؟

ترک بچارے چیخ رہے ہیں، قبرص میں کہرام مچا ہے
امن کی دیوی خاک بہ سر ہے، ظلم کا دیو ناچ رہا ہے

کوچہ کوچہ لاشیں لاشیں، گلیوں گلیوں خون رواں ہے،
عظمتِ آدم پوچھ رہی ہے، امن کا دعویدار کہاں ہے؟

ہمتِ ترکاں اللہ اللہ، آگ کے گھر میں رہتے ہیں[1]
جورِ مسلسل سہتے ہیں اور بات یہ سچی کہتے ہیں

امن کے راگی جھوٹے ہیں، انصاف کا نعرہ دھوکا ہے
اس دور میں سب کچھ جائز ہے، اس دور میں سب کچھ ہوتا ہے

مغرب والو! غور سے سن لو ایک تمہارا بھائی ہے
آگ اسی نے قبرص کے ہر قریے میں بھڑکائی ہے

لیکن تم کو علم نہیں ہے دانشور یہ کہتے ہیں
آگ لگانے والے خود بھی آگ میں جل کر رہتے ہیں

([1] نوٹ صفحہ ۱۲۱ پر ملاحظہ فرمائیے)

صبر کرو اے ترک جوانو! وقت اب آنے والا ہے
لاشۂ ظلم و جور کا بس اب قبر میں جانے والا ہے

گونجے گا انصاف کا نعرہ، امن کا بلبل چہکے گا
پھیلے گی اسلام کی خوشبو، گلشنِ قبرص مہکے گا

○

یہ نظم بحر متدارک مخبون شانزدہ رکنی میں ہے جس کے ارکان فعلن فعلن۔ فعلن فعلن۔ فعلن فعلن۔ فعلن فعلن ہیں مگر اساتذہ نے جائز رکھا ہے کہ آخری رکن فعلن کو فع سے بدل لیا جائے یعنی ایک ہی نظم کے کچھ شعر فعلن فعلن فعلن فعلن۔ فعلن فعلن۔ فعلن فعلن اور کچھ شعر فعلن فعلن۔ فعلن فعلن۔ فعلن فعلن۔ فعلن فعلن۔ فعلن فع میں لکھے جا سکتے ہیں۔ میں نے بھی اسے جائز رکھا ہے۔

(پیامؔ)

ویٹ نام

○

ویٹنام چیختا ہے، ویٹنام رو رہا ہے
قانون جاگتا ہے، انصاف سو رہا ہے

طیّارے آسماں سے شعلے اگل رہے ہیں
فصلیں جھلس رہی ہیں، انسان جل رہے ہیں

بوڑھے سسک رہے ہیں، بچے بلک رہے ہیں
پیمانے عصمتوں کے ہر سو چھلک رہے ہیں

یہ امن کے پجاری، تہذیبِ نو کے حامل
انساں نما درندے، انسانیت کے قاتل

آباد بستیوں کو برباد کر رہے ہیں
اعضا بریدہ انساں فریاد کر رہے ہیں

برپا ہے اک قیامت ویٹنام کی زمیں پر
لیکن شکن نہیں ہے تہذیب کی جبیں پر

کشمیر ہو کہ قبرص، ویٹنام یا فلسطیں
انصاف کے لہو سے ہر داستاں ہے رنگیں

چھایا رہے گا کب تک یہ ظلم کا اندھیرا
اس رات کا بھی ہوگا یارب کبھی سویرا

○

روڈیشیا

○

بیدار ہو رہا ہے مظلوم بَرِّاعظم
آزاد ہو رہا ہے محکوم بَرِّاعظم

اب دھوپ چڑھ رہی ہے سورج نکل رہا ہے
تاریک بَرِّاعظم پہلو بدل رہا ہے

سوئے ہوئے تھے اب تک جو شیر جاگ اُٹھے ہیں
شیروں کی گھن گرج سے چیتے بھاگ اُٹھے ہیں

کھوٹے کھرے کا فرق اب یہ جاننے لگا ہے
انساں مقام اپنا پہچاننے لگا ہے

ذہنوں سے خواجگی کے نشے اتر رہے ہیں
آقاؤں کو غلام اب بیدار کر رہے ہیں

رخصت ہوا زمانہ جیلوں کا، پھانسیوں کا
ہے راج اس زمیں پر اب اس کے باسیوں کا

قندیلِ حرّیت کی ہر سمت ضو فشاں ہے
دھارا سا روشنی کا ہر سو رواں دواں ہے

اس روشنی میں لیکن شامل ہے کچھ سیاہی
کچھ لوگ ہیں ابھی تک محکومِ تاجِ شاہی

اب تک روڈیشیا ہے مصروفِ آہ و زاری
اس دیس میں ہے اب تک آئینِ ظلم جاری

اسّی ہزار گورے قابض ہیں اس زمیں پر
داغِ سیاہ ہے یہ افریقہ کی جبیں پر

جس طرح بھی ہو ممکن اس داغ کو مٹاؤ
اہلِ روڈیشیا کو اس ظلم سے بچاؤ

نعرہ ہو یہ لبوں پر، ہاتھوں میں تیغِ بُرّاں
آزاد ہے ہر انساں، آزاد ہے ہر انساں

جنوبی افریقہ

اک خطۂ تاریک ہے ایسا بھی جہاں میں
ڈھلتی ہے سدا زیست جہاں آہ و فغاں میں

اس دیس کا مالک ہی یہاں بارِ زمیں ہے
یعنی جو سیہ فام ہے انسان نہیں ہے

ہر گام پہ پہرے ہیں تعصّب کے جفا کے
جیسے یہاں بندے نہیں رہتے ہیں خدا کے

گفتار کوئی چیز نہ ہے قیمتِ کردار
ٹھہرا ہے یہاں رنگ ہی تکریم کا معیار

انصاف ہے پابند یہاں، ظلم ہے آزاد
انسان سے نفرت پہ ہے قانون کی بنیاد

توفیق ملے کاش کسی اہلِ جنوں کو
توڑے کوئی اس نسل پرستی کے فسوں کو

انساں کی غلامی سے اب انسان ہو آزاد
ہو ختم کسی طرح تو یہ عرصۂ بیداد

پیدا ہو کوئی نور کا بھی چاہنے والا
اس خطۂ تاریک میں بھی کچھ ہو اجالا

جاگے تو ہیں کچھ اہلِ نظر خوابِ گراں سے
کچھ قلب تو بے چین ہوئے دردِ نہاں سے

ہاں سر سے کفن باندھ کے کچھ لوگ چلے ہیں
صحرائے شبِ غم میں دیئے کچھ تو جلے ہیں

گھبراؤ نہ سر ظلم کا خم ہو کے رہے گا
اب کے جو بہا خون تو ظالم کا بہے گا

ہے سخت مہم پھر بھی یہ سر ہو کے رہے گی
اس رات کی اک دن تو سحر ہو کے رہے گی

اقوامِ متحدہ

○

بقراطِ عہد جمع ہیں میزوں کے اِرد گرد
درپیش ہیں سیاستِ عالم کے مسئلے

جاری ہے ایک رکن کی تقریرِ دلپذیر
ایک رکن جوڑتا ہے خیالوں کے سلسلے

غوّاصِ بحرِ حکمت و دانش ہیں ان میں سب
لاتے ہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کے موتی نئے نئے
ہوتی ہیں روز پیش تجاویزِ نو بہ نو
پھر ان کو چاٹ جاتی ہے دیمک پڑے پڑے

بیچارے گُھل رہے ہیں غمِ کائنات میں
ہر اک کے دل میں امن کا جذبہ ہے موجزن
مینہ اس طرف برستا ہے لفظوں کا پے بہ پے
اور تیز ہو رہی ہے ادھر آتشِ چمن

زورِ بیاں بہت ہے، بڑے نکتہ رس ہیں یہ
لیکن کسی کے پاس نہیں قوتِ عمل
یوں تو ہیں جانشینِ ارسطو یہ سب، مگر
اک مسئلہ بھی ان سے ہوا آج تک نہ حل

اہلِ عرب ہیں بحرِ مصائب میں غوطہ زن
کشمیر کے عوام ہیں نالاں اسی طرح
ترکوں کا قتل عام ہے قبرص میں آج بھی
افریقیوں کا خون ہے ارزاں اسی طرح

لیکن پڑے جو ضرب "بڑوں" کے مفاد پر
کردیں ابھی زمین کا سینہ بھی چاک چاک
ہو جنگِ کوریا تو بڑے مستعد ہیں یہ
ہوتا ہے ایک رات میں قصہ تمام پاک

اک مردِ رازداں نے کہا سن کے میری نظم
اس "انجمن" میں سب تو نہیں ہیں قصوروار
کچھ ہاتھ ہیں کہ جن میں ہے قوت کی باگ ڈور
ساری خرابیوں کے یہ تنہا ہیں ذمہ دار

اوتھانٹ

○

ایک گمبھیر صدارات کے سنّاٹے میں
توڑ کر سینۂ افلاک گذر جاتی ہے
قلبِ مظلوم کو دیتی ہے سکوں یہ آواز
قوتِ ظلم اسے سن کے بپھر جاتی ہے

(اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل)

ایک آواز جو کہتی ہے جہاں بانوں سے
نوکِ شمشیر سے تو گھاؤ نہیں بھر سکتے
شہر برباد تو کر سکتے ہیں راکٹ لیکن
قلبِ ناشاد کو پُرشاد نہیں کر سکتے

ایک آواز جو کہتی ہے "سفید آقاؤ!
سب کا آدم ہے وہی، تھا جو تمہارا آدم
یہ سیہ فام بھی بیٹے ہیں اسی آدم کے
تم نے خود چاک کیا جس کا مقدّس پرچم"

ایک آواز جو کہتی ہے ستم رانوں سے
بادِ صرصر سے کبھی پھول نہیں کھل سکتے
امن کا راگ مناسب نہیں خوں خواروں کو
آب و آتش کبھی آپس میں نہیں مل سکتے

ایک آواز محبت بھری، پیاری آواز
گونجتی ہے جو سیاست کے عزاخانوں میں
ریگ زاروں پہ برستا ہوا بادل جیسے
عقل کی بات بیاباں جیسے ہو دیوانوں میں

سیّد احمد شہیدؒ

کٹا کے تیغِ ستمگار سے گلو تو نے
بچالی ملّتِ بیضا کی آبرو تو نے

خزاں زدہ تھا چمن، ہر طرف تھی ویرانی
پھر اس چمن کو دیا آب و رنگ و بو تو نے

ترس رہے تھے بہت دن سے تشنہ لب میخوار
شرابِ عشق سے پُر کر دیئے سبو تو نے

دریدہ دیکھ کے دامانِ اُمّتِ مظلوم
ہزار جان سے کی کوششِ رفو تو نے

لہو سے اپنے بنایا وہ عشق کا شہکار
زمیں پہ کھینچ دی تصویر ہو بہو تو نے

چلا کہاں سے، کہاں خیمہ زن ہوا آکر
دیا جنوں کو عجب جوشِ آرزو تو نے

جواں ہو شوق تو ہیں گردِ صحرائے کہسار
سکھائے عشق کو آدابِ جستجو تو نے

چلو! کہ خونِ مسلماں دہائی دیتا ہے
ندا یہ قریہ بہ قریہ دی، کو بہ کو تونے

جھپٹ پڑے صفِ اعدا پہ تیرے دیوانے
کچھ اس ادا سے لگائی صدائے "ہو" تونے

رہے گی یاد ہمیشہ عدو کی نسلوں کو
زبانِ تیغ سے کی تھی جو گفتگو تونے

مری نظر میں مقدس ہے ارضِ بالاکوٹ
کہ اپنے خوں سے کیا اس کو سُرخ رو تونے

○

(بالاکوٹ میں لکھی گئی)

مزارِ شاہ اسماعیل شہیدؒ پر

○

کھڑا ہوں آج میں اس کے مزارِ اقدس پر
اٹھا جو ملتِ اسلام کا عصا بن کر

سحاب چھٹ گئے بدعت کے، شرک و عصیاں کے
اندھیری شب میں رہا چاند کی ضیا بن کر

دلوں کو درد، نگاہوں کو روشنی بخشی
فضا میں تیر گیا شعلۂ نوا بن کر

چمن میں جب وہ چہکتا تو پھول کھل اٹھتے
وغا میں جب وہ کڑکتا تو صاعقہ بن کر

صدائے درد سے بیتاب ہو کے آ پہنچا
ستم زدوں کے لئے ان کا آسرا بن کر

سفینہ جن کا شکستہ تھا، بادباں کمزور
بھنور میں کود پڑا ان کا ناخدا بن کر

وفا سرشت تھا غیرت کا کوہِ اعظم تھا
نہ جی سکا وہ زمانے میں بے وفا بن کر

رفیق اس کے ہوئے خاک و خوں میں جب غلطاں
گرا غنیم پہ وہ شعلۂ قضا بن کر

فنا کے گھاٹ پہ پہنچا کے بد نہادوں کو
سپردِ تیغ ہوا پیکرِ رضا بن کر

جیا، کہ قوم کو عظمت سے ہمکنار کرے
مرا تو ملتِ بیمار کی شفا بن کر

سلام تجھ پہ غریب الدیار اسمٰعیلؒ!
شہیدِ قوم ہوا کشتۂ جفا بن کر

○

(بالاکوٹ میں لکھی گئی)

مشہدِ بالاکوٹ

ضلع ہزارہ کا وہ تاریخی مقام جہاں مجاہدینِ آزادی نے حضرت سیّد احمد شہیدؒ اور حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کے ساتھ راہِ حق میں جامِ شہادت نوش کیا۔

○

یہ ارضِ بالاکوٹ، شہیدوں کا مستقر
یہ سرزمیں، بنی تھی جو میدانِ خیر و شر

اے راہرو! ادھر سے ہو جب بھی ترا گزر
رکھنا قدم یہاں پہ بہت دیکھ بھال کر

ہیں اس زمیں میں دفن وہ گوہر وفاؤں کے
جن کی چمک دمک سے خجل انجم و قمر

ہر برگِ گل ہے خون کے چھینٹوں سے لالہ رنگ
اِک داستاں ہے درج یہاں ہر چٹان پر

یہ گھاٹیاں، یہ کھیت، یہ کہسار سربلند
یہ پتھروں کے سینوں سے اڑتے ہوئے شرر

یہ سبزہ زار، سرد یہ جھونکے ہواؤں کے
بے شک یہاں کے سارے مناظر ہیں خوش نظر

لیکن اگر ہو چشمِ حقیقت تجھے نصیب
ہر منظرِ حسیں نظر آئے لہو میں تر

شائد تجھے خبر ہو کہ یہ ہے وہ سرزمیں
برپا ہوا تھا حشر کبھی جس کی خاک پر

اُترا تھا اس زمین پہ اک ایسا کارواں
جس کا ہر ایک فرد تھا آہن سے سخت تر

روشن ہر ایک دل میں تھی قندیلِ آگہی
سر کیا تھا اک وبال تھا ہر اک کے دوش پر

دیوانہ وار دوڑ پڑے سوئے رزم گاہ
آیا انہیں غنیم جو کہسار پر نظر

تعداد میں قلیل تھے، اسباب میں حقیر
ٹکرا گئے حریف سے لیکن وہ بے خطر

انجام جو ہوا، سو ہوا، اس سے کیا غرض
چل کر دکھا گئے ہمیں خنجر کی دھار پر

ان کے جنوں پہ لاکھ خرد مندیاں نثار
عقبیٰ خرید لے گئے دنیا کو بیچ کر

○

(بالاکوٹ میں لکھی گئی)

قائدِ اعظمؒ

خزاں دیدہ تھا ہر نہالِ چمن
وطن کی فضائیں تھیں ظلمت فگن
اچانک طلوع اک ستارا ہوا
محمد علیؒ آشکارا ہوا

نگاہوں میں بجلی کی قوت نہاں
جبیں سے تھی اقبال مندی عیاں
تخیل ثریا کی رفعت لئے
عزائم پہاڑوں کی سطوت لئے

بظاہر وہ تھا جسم کا ناتواں
پر[1] آتی تھیں جنبش میں جب انگلیاں
کوئی سامنے اس کے آتا نہ تھا
حریف آنکھ اس سے ملاتا نہ تھا

[1] "پر" لیکن کے معنی میں اب متروک ہے مگر مجھے پسند ہے۔ (پیام)

نکالی تھی اس نے وہ طرزِ سخن
وہ تھا اس کی گفتار میں بانکپن
کہ جس سمت جا کر گل افشاں ہوا
بیاباں بھی تھا تو خیاباں ہوا

خراج اہلِ طوفاں سے لیتا ہوا
اکیلا سفینے کو کھیتا ہوا
نہنگوں سے دامن بچاتا رہا
بھنور میں بھی وہ مسکراتا رہا

نظر اس کی تھی عرش سے بھی پرے
قیامت کے اس نے طرارے بھرے
ہزار اپنی چالیں مخالف چلے
جو دیکھا تو منزل تھی قدموں تلے

گلِ آرزو پر نکھار آگیا
گلستاں پہ رنگِ بہار آگیا
تھے آوارہ ہم کو وطن مل گیا
عنادل کو اپنا چمن مل گیا

دیا تیری عظمت کا تاباں رہے
ہمیشہ تری روح شاداں رہے
ستارا وطن کا چمکتا رہے
یہ کندن ہمیشہ دمکتا رہے

○

شہیدِ ملّتؒ[1]

○

تھا ابھی تیرگیٔ غم کا اندھیرا باقی
مگر اسلام کا تابندہ ستارا نہ رہا
جس سے ظلمت میں ہوئی اک افقِ نو کی نمود
قلبِ ملّت کا وہ پرسوز شرارہ نہ رہا

(۱ پاکستان کے پہلے وزیر اعظم خان لیاقت علی خان)

رہنمائی کے لئے تیری ضرورت تھی ابھی
کتنے پرہول اندھیروں میں سفر کرنا ہے
کتنے دریا ہیں ابھی پار اترنے ہم کو
کتنی دشوار مہمات کو سر کرنا ہے

سدِ کہسار کے مانند ارادے تیرے
قوم کے قافلہ سالار! کہاں سے لائیں
جس کی گفتار میں کردار بھی پایا جائے
تجھ سا وہ غازیٔ کردار کہاں سے لائیں

کون سی آنکھ ہے جو خون نہ روئی تجھ پر
کون سا دل ہے جو اس غم میں الم کوش نہیں
اپنے محسن کو بھلا دیں، یہ نہیں ہو سکتا
ہم مسلمان ہیں احسان فراموش نہیں

خونِ ناحق کی قسم آج عہد کرتے ہیں
ہم وطن پر کبھی ادبار نہ آنے دیں گے
کشتِ گلزار کو سینچیں گے لہو سے اپنے
صحنِ گلشن سے بہاروں کو نہ جانے دیں گے

قائدِ ملّتِ اسلام! شہیدِ ملت!

تُو جہاں ہے وہاں رحمت کی گھٹا برسے گی

تُو نے ملّت کے لئے جان نچھاور کر دی

تیری تربت پہ ستاروں کی ضیا برسے گی

(اکتوبر ۱۹۵۱ء)

ابوبکر تفاوا بلیوا

نائیجیریا کے سابق وزیرِ اعظم جن کے ذہن میں اسلامی نائیجیریا کا ایک شمالی تصور تھا مگر قبل اس سے کہ نائیجیریا کے دوسرے عام انتخابات کے بعد وہ اسے عملی جامہ پہناتے عیسائی درندوں نے انہیں نہایت سفاکی سے شہید کر دیا

فلکِ عشق سے اک اور ستارا ٹوٹا

شمع اک اور بجھی اور سرِ شام بجھی

چاند نکلا تھا ابھی اور ابھی ڈوب گیا

ایک قندیل جلی اور سرِ شام بجھی

کونپلیں پھوٹ رہی تھیں کہ خزاں آپہنچی
صحنِ گلشن میں صبا آ کے پشیمان ہوئی
ساز چھیڑا ہی تھا مطرب نے کہ ٹوٹی مضراب
بزم سجنے بھی نہ پائی تھی کہ ویران ہوئی

اہلِ گلشن کے لئے جانِ چمن تھا جو پھول
دستِ گلچیں نے اسی پھول کو برباد کیا
اس کا گھر ہو گیا خود اس کے لہو سے رنگیں
جس نے اس گھر کو بڑے شوق سے آباد کیا

اے ابوبکر! ترے دل میں تھا دردِ ملت[1]
عاشقِ دین تھا تو، صاحبِ ایمان تھا تو
تھا بڑا "جرم" ترا عشقِ رسولِ عربی
اس خطا پر تجھے مارا کہ مسلمان تھا تو

تُو تو مقتول ہوا اپنی شہادت کہہ میں
رنگ لائے گا مگر تیرا لہو آخر کار
کاٹ ڈالیں گے سرِ ظلم، فدائی تیرے
خونِ ناحق ترا جائے گا نہ ہرگز بے کار

[1] اس ترکیب کے متعلق "معروضاتِ شاعر" کے زیرِ عنوان صفحہ ۲۳ پر اظہارِ خیال کر چکا ہوں۔ (پیام)

آگ لگتی ہے تو اُٹھتے ہیں دھویں کے بادل

ساز ٹوٹے تو نکلتی ہے بھیانک آواز

آج ہیں دست و گریباں ترے قاتل باہم

ہو گیا دیکھ مکافاتِ عمل کا آغاز

○